APPENDICES

APPENDIX-A

Question No. 1 What is the definition of Riba (ربا) according to the Holy Quran and Sunnah of the Holy Prophet (p.b.u.h). Does it cover the simple and compound interest existing in the present day financial transactions?

سوال نمبر ا: قرآن وسنت کے مطابق ربا کی کیا تعریف ہے؟ کیا یہ دور جدید کے مالیاتی معاملات کے سود مفرد اور سود مرکب پر مشتمل ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

مہتمم دار العلوم تفہیم القرآن

مالاکنڈ روڈ، مران

ربا کی تعریف:

"قرض کی اصل رقم پر جو زائد رقم مدت و مہلت کے مقابلے میں بطور شرط و معاہدہ لی جائے وہ ربا ہے"

اور یہ تعریف دور جدید کے سود مفرد اور سود مرکب پر یقیناً صادق آتی ہے۔ اصل راس المال پر ایک پیسے کا اضافہ لیا جائے یا کئی کئی گنا اضافہ لیا جائے وہ ربا ہے، جب کہ اس اضافے کی شرط معاہدے کے وقت لگائی گئی ہو۔ اس جواب کی تفصیل اور اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

(الف) ربا کے لفظی اور لغوی معنی۔

عربی زبان میں لفظ ربا کے لغوی معنی ہیں زیادت، اضافہ اور بڑھوتری، یہ لفظ قرآن کریم میں بھی زیارت اور نما کے معنوں میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً "ویربی الصدقات" (اور بڑھاتا ہے وہ صدقات کو) (البقرہ:۲۷۶) "فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت" (پس جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھوٹتی ہے) (الحج:۵)

"ربوا" اونچی جگہ کے معنوں میں آیا ہے۔ (المومنون:۵۰)

"رابیۃ" سیلاب پر رونما ہونے والی جھاگ" (الحاقہ:۱۰)

آئمہ لغت نے بھی ربا کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ علامہ جوہری (متوفی ۳۹۳ھ) اور علامہ ابن منظور افریقی (متوفی ۷۱۱ھ) دونوں نے لکھا ہے۔

"ربا الشیئ یربوا ربوا (ربوا و رباء) اے زادن"

(کوئی چیز بڑھ گئی، بڑھ رہی ہے بڑھنے کے ساتھ یعنی زیادہ ہو گئی ہے)

(الصحاح للجوہری طبع بیروت ۱۹۸۴، ۳۳۴۹/۶)

(لسان العرب للافریقی، طبع بیروت ۳۰۴/۴)

(ب) ربا کے شرعی مفہوم قرآن کی روشنی میں۔

ظاہر ہے کہ ہر قسم کا اضافہ اور نفع تو حرام نہیں بیع مرابحہ میں بھی اصل قیمت خرید پر نفع لیا جاتا ہے جو حلال ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز کی قیمت میں اضافہ ہے۔ قرض پر اضافہ نہیں ہے، تو ربا کا شرعی مفہوم معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ قرآن کریم میں مادہ پرستوں اور سود خوروں کا قول نقل ہوا کہ :

"انما البیع مثل الربوا و احل اللہ البیع و حرم الربوا"

(بیع بھی تو سود کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے)

(البقرہ: ۲۷۵)

مال کے بدلے مال کے معاہدے کو بیع کہا جاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ربا کو بیع کے مقابلے میں ذکر کیا ہے بیع کو حلال کر دیا ہے اور ربا کو حرام، تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ ربا کی صورت میں راس المال پر جو اضافہ لیا جاتا ہے یہ بیع نہیں ہے، یعنی مال کے بدلے مال کا معاملہ نہیں ہے تو پھر یہ زائد مال کس چیز کے بدلے میں لیا اور دیا جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہم کو اگلی آیات میں بڑی صراحت اور آسانی کے ساتھ مل گیا ہے۔

"و ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین و ان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لا تظلمون و لا تظلمون، وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ"

(البقرۃ: ۲۷۸۔۲۷۹۔۲۸۰)

(اور چھوڑ دو جو کچھ بقایا ہے سود کا، اگر تم مومن ہو۔۔ اور اگر تم توبہ کر لو گے تو ملیں گے تم کو تمہارے اصل اموال نہ تم ظلم کرو گے اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔ اور اگر وہ تنگدست ہو (مقروض) تو اس کو مہلت دینی ہو گی آسودہ حالی تک)

"اصل اموال" "وہ تنگدست ہو" اور "اس کو مہلت دینی ہو گی" یہ الفاظ بغیر کسی ابہام کے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ربا کا مال مہلت اور مدت کے بدلے میں لیا جاتا ہے، ان آیات میں تدبر کرنے سے ربا کی شرعی تعریف یہ قرار پائی کہ "قرض کے اصل مال پر جو زائد رقم مدت کے بدلے میں لی جاتی ہے وہ ربا ہے" اللہ تعالیٰ نے اس زائد رقم کو حرام قرار دیتے ہوئے حکم دیا ہے کہ اس زائد رقم کو جو تم مہلت کے بدلے میں لیتے ہو چھوڑ دو اور اپنا اصل مال وصول کر لو۔ مقروض اگر نادار ہو تو بہتر یہ ہے کہ اصل مال بھی معاف کر دو لیکن اگر ایسا نہ کر سکو تو کشادہ ستی تک مہلت دینا تو تم پر لازم ہے اور یہ مہلت نادار مقروض کا حق ہے جو تمہیں دینا پڑے گا۔

(ج)۔ ربا کا مفہوم احادیث و آثار کی روشنی میں

ربا کے یہی شرعی معنے جو قرآن کریم کی درج بالا آیات سے معلوم ہوتے ہیں احادیث و آثار سے بھی ثابت ہوتے ہیں، جو قرآن کریم کی تعبیر و تشریح کا مستند ذریعہ ہیں۔

"عن عمارۃ الھمدانی سمعت علیا یقول قال رسول اللہ کل قرض جر نفعا فھو ربا"

(حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ قرض جو نفع کھینچتا ہو تو اس کا یہ نفع سود ہے)

(المطالب العالیہ از ابن حجر طبع بیروت ج ۱، ص: ۴۱۱، رقم الحدیث ۱۳۷۳، بحوالہ مسند حارث)

(کنز العمال از علی المتقی ج۶، ص: ۲۳۸، حدیث: ۱۵۵۱۶، الجامع الصغیر از سیوطی ج ۲، ص: ۹۴)

اصل میں یہ حدیث حارث بن محمد بن ابی اسامہ التمیمی البغدادی (متوفی ۲۸۲ھ) کی کتاب "مسند حارث" میں سند کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے المطالب العالیہ کی تعلیق میں لکھا ہے کہ یہ حدیث مسند حارث کے مخطوطہ کے ج ا، ص: ۳۰۸، پر موجود ہے۔اس کی سند میں سوار بن مصعب نامی ایک راوی آیا ہے، جو ضعیف اور غیر ثقہ راوی ہے۔

امام بخاری نے اُسے منکَر الحدیث (کاف کی زبر کے ساتھ) کہا ہے۔ (تاریخ کبیر از بخاری ج ۴، ص: ۱۶۹، نمبر ۲۳۵۹) نسائی، ابو داؤد، احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید قطان اور دار قطنی نے بھی اسے متروک اور غیر ثقہ کہا ہے۔

(کتاب الضعفاء از ابن جوزی، بیروت ۱۹۸۶، جلد ۲۔ ۳۱/۳)

(میزان الاعتدال از ذھبی ۲۴۶/۲)

لیکن ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام الحرمین اور امام غزالی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

(التلخیص الحبیر از ابن حجر طبع سانگلہ ہل پاکستان، ۳۴/۳)

سیوطی کی جامع صغیر کے شارح عزیزی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن لغیری ہے یعنی شواہد کی وجہ سے قابل قبول ہے۔

(اعلاء السنن از مولانا ظفر احمد عثمانی ۴۹۹/۱۴)

(بحوالہ عزیزی ۸۷/۳)

محدثین کا تسلیم شدہ قاعدہ ہے کہ جس حدیث کے دوسرے اسانید کے ساتھ شواہد موجود ہوں یعنی اس مفہوم کی دوسری روایات موجود ہوں، اگرچہ صحابہ کے اقوال ہوں اور سلف و آئمہ مجتہدین کے ہاں اس حدیث کو تلقی بالقبول حاصل ہو یعنی انہوں نے اس حدیث کو دلیل بنایا ہو تو وہ سند اضعیف ہونے کے باوجود قابل استدلال ہوتی ہے۔اب اس حدیث کے کچھ شواہد ملاحظہ کیجیے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ حدیث سنداً اور روایتاً ضعیف ہونے کے باوجود معناً اور روایتاً قابل قبول ہے جب کہ اس کا مفہوم قرآن کریم سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرض کی اصل رقم پر اضافے کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ "عن فضاله بن عبيد قال كل قرض جر منفعته فهو وجه من وجوه الربا"

(سنن کبری للبیہقی ۳۵۰/۵، و نصب الرایہ ۶۰/۴)

(حضرت فضالہ (صحابی) فرماتے ہیں کہ جو قرض نفع کھینچتا ہے وہ سود کی ایک قسم ہے)۔ (۳، ۴، ۵، ۶، ۷)

امام بیہقی نے "کل قرض جر منفہ" کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس کے تحت حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم سے روایات نقل کی ہیں۔

(موقوف روایات) جس کا مفہوم یہ ہے کہ قرض پر نفع لینا سود ہے۔

(ج۵، ص: ۳۴۹۔۳۵۰)

۸۔ "ان رجلا الی عبداللہ ابن عمر فقال یا ابا عبدالرحمن انی اسلفت رجلا سلفا واشترطت علیہ افضؒ مما اسلفتہ فقال عبداللہ بن عمرؓ فذالک الربا"

(موطاامام مالک طبع قاھرہ، باب الربا فی الدین ج ۲ ص: ۶۷۲)

(ایک شخص ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے مگر یہ شرط لگائی ہے کہ مجھے اس سے زائد دوگے، جو میں نے تمہیں دیا ہے، ابن عمرؓ نے فرمایا یہی تو ربا ہے)

۹۔ عن زید بن اسلم ؒ قال کان الربوا فی الجاھلیۃ ان یکون للرجل علی الرجل الحق الی رجل فاذا حل الاجل قال اتقضی ام تربی فان قضی اخذوا الا زادہ فی حقہ و اخر عنہ فی الاجل۔"

(موطاامام مالکؒ، ج ۲، ص: ۶۷۲)

(زید بن اسلم تابعی فرماتے ہیں کہ جاہلیت میں ربا کی شکل یہ ہوتی تھی کہ ایک شخص کا دوسرے پر کوئی حق واجب الادا ہوتا جس کی میعاد مقرر ہوتی تھی جب ادائیگی کی میعاد آجاتی تو دائن اپنے مدیون کو کہتا حق دیتے ہو یا سود دیتے ہو، اگر وہ دے دیتا تو لے لیا جاتا اور اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو قرض کی مقدار میں اضافہ کر دیا جاتا اور اس کے بدلے میں مدت بڑھا دی جاتی۔)

۱۰۔۱۱۔ قال مجاہدؒ و مثلہ قال قتادہؒ کانوا فی الجاھلیۃ یکون للرجل علی الرجل الدین فیقول لک کذا وکذا وتوخر عنی فیوخر منہ"

(تفسیر ابن جریر)

(حضرت مجاہدؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہوتا تو مدیون دائن کو کہتا کہ میں تم کو اتنی اتنی مقدار زائد دے دوں گا، مگر تم مہلت بڑھا دو چنانچہ وہ اس زائد رقم کے بدلے میں مدت بڑھا دیتے۔)

(د)۔ ربا کی تعریف اجماع امت کی روشنی میں

قرآن کریم اور احادیث وآثار کی روشنی میں ربا کی مذکورہ تعریف پر امت مسلمہ کا اجماع ہے اور اجماع بھی حجت شریعہ ہے۔ ابن عبدالبر (متوفی ۴۲۳ھ) لکھتے ہیں:

"و قد اجمع المسلمون نقلا عن نبیہم ان اشتراط الزیادۃ فی السلف ربا ولو کان قبضتہ علف او حبہ"

(التمہید لابن عبدالبر طبع لاہور، ۱۹۸۳ء، ج ۴، ص: ۶۸)

(مسلمانوں نے اپنے نبی سے نقل کی بناء پر اجماع کر لیا ہے کہ قرض کے اصل مال پر اضافے اور زیادتی کی شرط لگانا سود ہے، اگرچہ یہ اضافہ ایک مٹھی گھاس (جانوروں کے لیے چارہ) ہو یا ایک حبہ (پیسہ) ہو۔)

ابن رشد نے بھی اس تعریف کو اجماعی کہا ہے۔

(بدایۃ المجتہد، ج ۲، ص: ۱۲۷)

(ھ)۔ ربا کی تعریف مفسرین اور فقہاء کی نظر میں

قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت شدہ ربا کی مذکورہ تعریف مفسرین اور فقہاء نے بھی نقل کی ہے۔ چند حوالے ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ امام المفسرین محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی تفسیر "جامع البیان عن تاویل آی القرآن" میں لکھتے ہیں، جو ام التفاسیر کہلاتی ہے۔

"و حرم الزیادۃ التی یزاد رب المال بسبب زیاۃ غریمہ فی الاجل و تاخیرہ دینہ علیہ"

(تفسیر ابن جریر، ج ۳، ص ۱۰۳، بحوالہ فی ج ۴، ص: ۹۰)

(حرام کردہ سود سے مراد وہ اضافہ ہے جو مال کے مالک (دائن) کے لیے کیا جاتا ہے، جس وجہ سے کہ اس نے اپنے مقروض کے لیے مدت بڑھادی ہے اور اپنے قرض کی وصولی مؤخر کردی ہے۔)

۲۔ امام طحاویؒ (متوفی ۳۲۱ھ) لکھتے ہیں کہ ربا کی شکل یہ ہوتی تھی کہ مدیون دائن کو کہتا:

"اجلنی منہ الی کذا و کذا بکذا و کذا درھما ازیدکھا فی دیتک"

(مجھے قرض کی ادائیگی میں اتنی مہلت اور دے دو تو میں اتنے روپے تمہارے قرض میں بڑھادوں گا)

(شرح معانی الآثار للطحاوی باب الرباج ۲، ص ۲۳۲) :

۳۔ امام جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) فرماتے ہیں:

"و ھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ علی المستقرض"

(احکام القرآن، ج ۱، ص: ۴۲۹) :

(ربا قرض کا وہ معاملہ ہے جس میں میعاد مقرر کی گئی ہو قرض لینے والے پر قرض کی اصل رقم سے کچھ زیادہ دینے کی شرط لگائی گئی ہو)۔

۴۔ امام بغوی (متوفی ۵۱۶ھ)

"ان اھل الجاھلیۃ کان احدھم اذا حل مالہ علی غریمہ فطالبہ فیقول الغریم لصاحب الحق زدنی فی الاجل حتی ازیدک فی المال فیفعلان ذالک"

(معالم التنزیل للبغویؒ طبع ریاض ۱۴۰۹ھ ج ۱، ص: ۳۴۱)

(جاہلیت کے زمانے میں جب کسی کے مال کی ادائیگی کی میعاد آجاتی وہ اپنے قرض مال کا مطالبہ کرتا تو اس کا مقروض کہتا مدت بڑھادو تو میں تیرے قرض میں اضافہ کردوں گا، چنانچہ دونوں ایسا معاملہ کرلیتے۔)

۵۔ قاضی ابوبکر ابن عربیؒ (متوفی ۵۴۷ھ)

"و کان الربا المعروف عندھم یبایع الرجل الرجل الی رجل فاذا حل الاجل قال اتقضی ام تربی--- فحرم اللہ الربا۔ ان من زعم ان ھذہ الاۃ مجملۃ فلم یفہم مقاطع العریصۃ"

(احکام القرآن، ج ۱، ص: ۳۲۰، طبع بیروت ۱۹۸۸ء)

(ربا عربوں کے ہاں ایک معروف چیز تھی ایک شخص دوسرے کے ساتھ مدت مقررہ تک قرض کا کوئی معاملہ کرتا جب معیاد آجاتی تو قرض خواہ قرضدار سے کہتا میرا قرض دیتے ہو یا سود دیتے ہو تو اللہ نے سود کو حرام کردیا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ربا سے متعلق یہ آیت مجمل ہے تو اس نے شریعت کے قطعی اور طے شدہ احکام کو نہیں سمجھا۔)

۶۔ امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ)

"و اما ربا السید فهو الا سر الذی کان مشهورا متعارفا بینهم فی الجاهلیۃ و ذالک انهم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذوا کل شعر قدرا معینا و یکون راس المال باقیا ثم اذا حل الذین طالب المدیون براس المال فان تحذر علیہ الاداء زادوا فی الاجل و الحق فهذا هو الربوا الذی کانو فی الجاهلیۃ یتعاملون بہ"۔

(تفسیر کبیر از امام رازی طبع مصر ۱۹۳۸ج ۷ ص ۹۱)

(ادھار کا سود جاہلیت کے زمانے میں معروف و مشہور تھا اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ لوگ اپنا ادھار مال اس شرط پر لوگوں کو دیتے کہ اتنی مقدار ماہانہ سود دینا ہوگا اور اصل رقم بدستور باقی رہے گی۔ جب ادائیگی کی میعاد پوری ہو جاتی تو قرض دار سے ادائیگی کا مطالبہ کرتے اگر وہ ادائیگی سے معذور ہوتے تو میعاد بڑھا دی جاتی اور اس میعاد کے بدلے میں سود بھی بڑھا دیا جاتا یہی وہ ربا تھا جس پر جاہلیت کے زمانے میں معاملات کرتے تھے۔)

اس بحث سے ربا کی وہی تعریف سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر ابتداء میں ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہ "قرض کی اصل رقم پر جو زائد رقم بطور شرط و معاہدہ لی جائے وہ ربا ہے"

(د)۔ ربوا کی اس تعریف میں سود مرکب بھی شامل ہے

ربا کی یہ تعریف سود مفرد اور سود مرکب دونوں پر صادق آتی ہے اور دونوں حرام ہیں۔ حرم الربا میں لفظ ربا عام ہے جس میں تخصیص اور استثناء کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ عدم تخصیص کی دلیل موجود ہے، اور وہ "فان تبتم فلکم رؤوس اموالکم" اس آیت میں صرف راس المال ہی لینے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اس پر اضافے کو جائز تسلیم نہیں کیا گیا خواہ وہ اضافہ تھوڑا ہو یا کئی گنا زیادہ ہو۔ اسی طرح کل قرض "جر نفعا فهو ربا" اور اس مفہوم کی دوسری روایات میں ہر قسم کے نفع کو جو قرض کی اصل رقم پر لیا جائے اسے سود قرار دیا گیا ہے خواہ مفرد ہو یا مرکب ہو۔ باقی رہی سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۰ جس میں آیا ہے کہ "اے ایمان والو مت کھاؤ سود کئی کئی گنا بڑھا کر" تو یہ قید حرمت کی شرط نہیں ہے بلکہ امر واقعہ کا اظہار ہے، کہ عربوں میں یہ جرم عظیم رائج تھا کہ مقروض پر عائد کردہ سود بعض اوقات "اضعافا مضاعفہ" تک پہنچ جاتا اس کے علاوہ سورۃ آل عمران کی یہ آیت سورۃ بقرہ کی آیات سے پہلے نازل ہوئی تھی اور سورۃ بقرہ کی آیات آخر میں نازل ہوئی تھیں جن میں مطلق ربا کو حرام کیا گیا ہے تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اصل میں ربا کی حرمت کے احکام شراب کے احکام کی طرح تدریجاً نازل ہوئے تھے۔

پہلی آیت جس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ سود میں برکت نہیں ہے۔ اور یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے، مکہ میں نازل ہوئی تھی، جو یہ ہے:

"وما اتیتم من ربا لیربو فی اموال الناس فلا یربو عندالله وما اتیتم من زکوۃ تریدون وجہ الله فاولئک هم المضعفون"

(الروم ۳۰: ۳۹)

(اور جو کچھ دیتے ہو تم ربا میں سے تاکہ وہ لوگوں کے اموال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے پس وہ نہیں بڑھ سکتا اللہ کے دربار میں اور جو کچھ دیتے ہو تم صدقے میں سے جس سے اللہ کی خوشنودی چاہتے ہو تو ایسے ہی لوگ بڑھانے والے ہیں اپنے اموال کو۔)

ربا کا لفظ اس آیت میں اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے جس میں اصطلاحی سود بھی شامل ہے اور وہ تحفہ بھی اس میں شامل ہے جو برادری اور دوستوں کی تقریبات میں دیا جاتا ہے تاکہ اس کے بدلے میں زیادہ مل جائے، جسے عرف عام میں نیوتہ کہاجاتا ہے۔ عام مفسرین نے تو اس جگہ ربا سے یہی نیوتہ مراد لیا ہے لیکن حسن بصری اور سدی نے متعارف سود ہی مراد لیا ہے۔ روح المعانی اور تفسیر نیشاپوری میں بھی اسی کو ترجیح دی گئی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں۔ اس آیت میں سود کی برائی تو بیان کی گئی ہے لیکن قطعی طور پر حرام نہیں کیا گیا صرف نفرت دلائی گئی ہے تاکہ لوگ ذہنی طور پر اسے چھوڑنے پر تیار ہو جائیں۔

دوسری آیت سورۃ النساء جو مدنی سورۃ ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہودیوں پر عذاب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ سود کھاتے تھے اس سے مسلمانوں کے ذہنوں میں سود کی مزید نفرت پیدا کی گئی تاکہ وہ ذہنی طور پر اسے چھوڑنے پر تیار ہو جائیں۔

"و اخذهم الربا و قد نهوا عنه و اكلهم اموال الناس بالباطل و اعتدنا للكافرين منهم عذابا اليما" (النساء:۴: ۱۶۱)

(یہ سزا اس وجہ سے بھی دی گئی تھی کہ یہ لوگ (یہود) سود لیتے تھے حالانکہ انہیں تو اس سے منع کر دیا گیا تھا اور اس وجہ سے بھی کہ یہ لوگ دوسرے لوگوں کا مال ناحق، کھاتے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے)

تیسری آیت سورۃ آل عمران کی ہے اور یہ بھی مدنی سورۃ ہے اس میں سود مرکب کی ممانعت کی گئی ہے کہ یہ ظلم عظیم تو نہ کرو کہ کئی کئی گنا بڑھا کر سود کھاتے ہو گندگی کی تھوڑی مقدار بھی غلاظت ہے، اور قبیح ہے مگر جب اس غلاظت کو بڑی مقدار میں کھایا جائے تو یہ خباثت کی انتہا ہے۔ غریب کے خون کا ایک قطرہ چوسنا بھی ظلم ہے، لیکن جب اس کے خون کی بڑی مقدار چوسنے کی عادت پڑ جائے تو یہ ظلم کی انتہا ہے۔

"يا ايها الذين آمنوا لا تاكلوا الربا اضعافا مضٰعفة واتقوا الله لعلكم تفلحون" (آل عمران ۳:۱۳۰)

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت کھاؤ سود کئی کئی گنا بڑھا کر اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)

چوتھے اور آخری مرحلے پر سورۃ بقرہ کی سات آیات نازل ہوئی تھیں جن کے درمیان میں ایک آیت زکوۃ کے بارے میں ہے اور آخری میں خوف خدا اور فکر آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، بہتر یہی ہے کہ ان سات آیات کو نقل کر دیا جائے جو یہ ہیں۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّـهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّـهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللَّـهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّـهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّـهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّـهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن

كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّـهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾ (البقرہ: ۲۷۵------۲۸۱)

(جو لوگ کھاتے ہیں سود وہ کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جسے خبطی بنا دیا ہو شیطان نے دیوانہ بنا کر یہ اس لیے کہ یہ لوگ کہتے ہیں بیع بھی تو سود کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، پس جس کو بھی یہ نصیحت پہنچ گئی اس کے رب کی جانب سے اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا ہے وہ اسی کا ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اور جو کوئی دوبارہ پلٹ جائے تو ایسے لوگ دوزخ والے ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود سے برکت مٹا دیتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ پسند نہیں کرتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام کیے ہیں اور نماز قائم کی ہے اور زکوۃ دی ہے تو ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو کچھ بھی باقی ہو سود میں سے اگر تم مومن ہو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اور اگر تم نے توبہ کر لی ہو تو ملیں گے تم کو تمہارے اصل مال نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا اور اگر وہ تنگدست ہو تو اس کے لیے مہلت ہے آسودہ حالی تک اور اگر معاف کر دو تو یہ زیادہ بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا ہر شخص کو اس کے اس عمل کا جو اس نے کیا ہو ان پر ظلم نہ ہوگا)۔

ان آیات میں وہ آخری اور حتمی حکم دیا ہوا ہے کہ جس میں مفرد اور مرکب سود کی کوئی تفریق نہیں سود کا بقایا اگر ایک حبہ بھی ہو تو اسے بھی لینا جائز نہیں ہے، ظاہر ہے کہ قطعی اور حتمی حکم وہی ہوتا ہے۔ جو آخر میں ہو۔ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

"اخر آیتہ نزلت علی النبی آیۃ الربا"

(بخاری شریف کتاب التفسیر واتقوا یوما، البقرہ: ۱۸۱)

اس روایت سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ سورۃ بقرہ کی آیات دوبارہ حرمت ربا اس بارے میں آخری آیات ہیں جو اس موضوع پر باقی تمام روایات پر حاوی ہیں اور ان میں ہر نوع کے سود کو حرام کر دیا گیا ہے، جو لوگ اضعافاً مضاعفۃ کی قید کو سود مفرد کے جواز کی دلیل بنا رہے ہیں ان کی مثال اس بے وقوف شخص کی طرح ہوگی جو "لاتقربوا الصلوۃ وانتم سکاری" کو اس بات کی دلیل بناتا ہو کہ شراب پینا صرف نماز کے اوقات میں حرام ہے دوسرے اوقات میں حرام نہیں ہے اس لیے شراب پینے اور نشہ آور چیز کے استعمال کو صرف نماز کے اوقات میں منع کیا گیا ہے تو ایسا شخص یا تو دانستہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہوگا یا پھر اسے اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ شراب کی حرمت کا حکم تدریجاً نازل ہوا تھا ایک مرحلے میں صرف نماز کے اوقات میں نشہ حرام تھا مگر آخری اور حتمی حکم تو یہ آیا تھا کہ شراب گندی چیز ہے اس سے دور رہو، اسی طرح سود کے احکام بھی تدریجاً نازل ہوئے تھے، مگر آخری اور حتمی حکم ہر قسم کے سود کی حرمت کا تھا، جو اب قیامت تک باقی ہے، جسے کوئی شخص مسلمان ہوتے ہوئے نہ ختم کر سکتا ہے اور نہ اس میں ترمیم و تخصیص کر سکتا ہے۔

(ز) ربا حکمی یا ربا خفی یا ربوا الفضل

ربا کی جو تعریف سطور مذکورہ میں کی گئی ہے یہ اس ربا کی تعریف ہے جس کی حرمت قرآن کریم کی مذکورہ آٹھ آیات سے ثابت ہے اس کی حرمت بھی قطعی ہے اور اس کی تعریف بھی متفق علیہ ہے اور اس میں کسی قسم کا ابہام و اجمال بھی نہیں ہے اور یہی وہ ربا ہے جو عربوں میں

معروف و مشہور تھا جس کو وہ بیع کی طرح حلال سمجھتے تھے، اس کو ربا القرآن بھی کہتے ہیں اس لیے کہ اس کی حرمت قرآن سے ثابت ہے۔ اسے ربا جلی اور ربا حقیقی بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ یہ کھلا اور حقیقی معنوں میں سود ہے صرف سود کا ذریعہ نہیں ہے اور اس کا مشہور نام تو ربا النسیہ ہے اس لیے کہ یہ سود ادھار پر لیا جاتا ہے۔ لیکن ربا کی ایک اور قسم بھی ہے جسے ربا حکمی کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس پر ربوا کا حکم نافذ ہوتا ہے اور یہ حقیقی اور جلی ربا کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اسے ربا خفی بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ کھلا سود نہیں ہے بلکہ کھلے سود کا ذریعہ اور چور دروازہ ہے اور اسے ربا الفضل بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں دس بدست بیع میں بھی ایک جانب سے زیادت اور اضافہ ممنوع ہے۔ ربا کی یہ قسم قرآن سے ثابت نہیں ہے بلکہ حدیث صحیحہ سے ثابت ہے اور یہ حرمت سد ذریعہ کے طور پر ہے۔ ربا الفضل کی حرمت کے بارے میں احادیث کی تعداد تو زیادہ ہے مگر ایک حدیث بطور نمونہ عرض خدمت ہے:

"عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ الذھب بالذھب و الفضۃ بالفضۃ والتمر بالتمر والبر بالبر والشعیر بالشعیر والملح بالملح مثلا بمثل یدا بید فمن زاد واستزاد فقد اربی الاخذ والمعطی فیہ سواء"

(صحیح مسلم کتاب المساقات باب الصرف)

(سونا سونے کے بدلے میں، چاندی چاندی کے بدلے میں، کھجور کھجور کے بدلے میں، گندم گندم کے بدلے میں، جو جو کے بدلے میں اور نمک نمک کے بدلے میں بیچا جا سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ برابر برابر ہوں اور دست بدست ہوں۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تو سود کا لین دین ہے، لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں۔)

ان چھ چیزوں میں ادھار لین دین تو اس حدیث کی بنا پر جائز ہی نہیں ہے اور اگر معاملہ دست بدست کا ہو تو پھر ایک ہی جنس کے تبادلے میں ایک طرف سے اضافہ ممنوع ہے البتہ اگر جنس مختلف ہو مثلاً گندم کا تبادلہ جو سے یا سونے کا تبادلہ چاندی سے تو پھر اضافہ جائز ہے مگر ادھار پھر بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"فاذا اختلفت الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یدا بید" **(مسلم باب الصرف)**

(جب چیزوں کی اصناف مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ معاملہ دست بدست ہو۔)

ربا الفضل کے حرام ہونے کی علت و حکمت حقیقی ربا کا راستہ بند کرنا ہے اور سودی ذہنیت کا انسداد ہے تاکہ اسے حقیقی سود یعنی ربا النسیہ کا ذریعہ نہ بنا سکیں یہی حکمت حضرت عمر رضی اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ:

سونا سونے کے بدلے میں فروخت نہ کرو مگر برابر، اور ایک دوسرے پر اضافہ نہ کرو، چاندی چاندی کے بدلے نہ بیچو، مگر برابر، ایک کا دوسرے پر اضافہ نہ کرو اور چاندی سونے کے بدلے میں ادھار نہ بیچو کہ ایک طرف سے ادھار ہو اور دوسری طرف سے نقد ہو۔ اگر تم سے گھر تک مہلت مانگی جائے تو اتنی مہلت بھی نہ دو، اس لیے کہ "انی اخاف علیکم الرماء والرماء الربا" (مجھے خطرہ ہے کہ اس طرح تم کہیں حقیقی سود میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔)

(موطا امام مالک فی البیوع باب الذھب بالذھب، ۶۳۴/۲)

ابن قیم فرماتے ہیں۔

"الربا نوعان نوع حرم لما فیہ من المفسدۃ وھو ربا النسیئۃ و نوع حرم تحریم الوسائل و سداء للذرائع"

(اعلام الموقعین، ۱۶۷/۴، ۲۴۴۔ بیروت)۔

(الموافقات للشاطبیؒ 4/40-44

ربا کی دو قسمیں ہیں ایک ربا النسیہ جو ذاتی خرابی کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو اس لیے حرام ہے کہ یہ ربا النسیہ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

۔ مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

مہتمم دار العلوم، کورنگی۔ کراچی۔

ربا کی تعریف

لغت میں ربا کے معنی زیادتی کے ہیں اور اسے ربا اور ربوا دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے۔ (الرازی: تفسیر مفاتیح الغیب، ۳۵/۴، مطبعہ حسینیہ۔ مصر)۔ قرآن کریم میں بھی دونوں رسم الخط استعمال ہوئے ہیں۔ "الربوا" (البقرہ ۲۷۵) اور "ربا" (سورۃ الروم ۳۹) بحوالہ مقالہ ربوا از مفتی محمد شفیع (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لاہور) وہ ربوا جسے قرآن کریم نے شدومد کے ساتھ حرام قرار دیا ہے اور جس کی تعریف سوالنامہ کے ذریعے مطلوب ہے وہ "ربا النسیہ" ہے۔ جو دور و جاہلیت میں بکثرت پھیلا ہوا تھا اور آج بھی سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد اسی پر ہے۔

اس ربا کی تعریف بالکل واضح ہے یعنی قرض پر مشروط نفع لینا اور دینا۔ ربا کے اسی مفہوم کو امام ابو بکر جصاص رازی نے اپنی معروف کتاب "احکام القرآن" میں قانونی الفاظ میں اسی طرح بیان کیا ہے۔

"هو القرض المشروط فيه الاجل و زيادة مال على المستقرض"۔

یعنی قرض کا وہ معاملہ جس میں ایک مخصوص مدت اور قرض دار پر مال کی کوئی زیادتی معین کر لی گئی ہو۔

"ربا" کا یہ مذکورہ بالا مفہوم اور اس کی یہ قانونی تعریف لغت عرب، دور جاہلیت کے حالات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و صحابہ کے آثار اور پھر مفسرین، محدثین اور فقہاء کی کتابوں سے ثابت شدہ چلی آ رہی ہے۔ الفاظ کے معمولی فرق، اور تعبیرات کے اختلاف سے قطع نظر "ربا" کا ہمیشہ یہی مفہوم سمجھا گیا ہے اور آج بھی "ربا" کے اردو ترجمہ "سود" کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے۔

لغت عرب

۱۔ علامہ مرتضی زبیدی نے عربی لغت کی مشہور کتاب "تاج العروس" میں امام لغت زجاج کی یہ تعریف نقل کی ہے کہ "كل قرض يوخذ به اكثر منه" (۱۴۴/۱۰)

۲۔ ابو منصور الازھری (۲۸۲۔۔۔ ۳۷۰ھ) نے بھی یہی تعریف ان الفاظ میں نقل کی ہے "کل قرض یوخذ بہ اکثر منہ او تجر بہ منفعتہ"

(تہذیب اللغۃ ۱۵/۳۷۴، دار الکاتب العربی القاہرۃ)۔

۳۔ یہی تعریف ابن منظور نے بھی اپنی کتاب "لسان العرب" میں بیان کی ہے۔ (دیکھیں لسان العرب ص ۱۷ جلد ۱۹، طبع بولاق)

۴۔ جوھری کی مشہور لغت "صحاح" جو احمد عبدالغفور عطا کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے اس میں ربا کی ایک لغت "ربیہ" کا ذکر کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں

"والربیہ مخففہ لغہ فی الربا۔ و فی الحدیث فی صلح اھل نجران" لیس علیہم ربیہ ولا دم -- ومعنی الحدیث انہ اسقط عنہم کل دم کانوا یطلبون بہ وکل ربا کان علیھم الا رؤوس اموالہم فانہم یردونہا"

(الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ ۲۳/۶، دار الکتاب، مصر)

۵۔ راغب الاصفہانی نے کہا "والربا الزیادۃ علی راس المال"۔

(مفردات القرآن ۱۸۵، طبع نور محمد کراچی)

۶۔ ابن منظور لسان العرب میں "لیط" مادہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"و اللیاط الربا سمی لیاطا لانہ شیئ لا یحل الصق بشیء و اضیف الیہ، والربا ملصق براس المال-- واللیاط فی ھذا الحدیث الربا الذی کانوا یربونہ فی الجاھلیۃ ردھم اللہ الی ان یاخذوا رؤوس اموالھم و یدعوا الفضل علیھا"

(لیاط ربا کو کہا جاتا ہے کیونکہ لیاط وہ چیز ہے جو حلال نہ ہو اور کسی دوسری چیز سے چمٹی اور ملی ہوئی ہو اور ربا بھی راس المال سے اسی طرح چمٹا ہوا ہوتا ہے۔۔۔اس حدیث میں بھی لیاط سے مراد ربا ہے جسے اہل جاہلیت وصول کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنا اصل راس المال لے لیں اور زائد (سود) چھوڑ دیں۔

(ابن منظور لسان العرب 273/9، طبعۃ میریہ)

۷، نیز یہی ابن منظور لسان العرب میں "سلف" کے لفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ولان کل فرض جر منفعتہ فھو ربا" اور اس لیے کہ ہر وہ قرض جو نفع کو کھینچ کر لائے وہ "ربا" میں داخل ہے۔

ابن منظور لسان العرب ۱۱/۶۰ طبعہ میریہ)

۸۔ ابن فارس نے "ربا" کی تعریف ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس کے مفہوم سے ہر شخص واقف ہے، فرمایا "والربا فی المال معروف"

(ابن فارس اللغوی مجمل اللغۃ ۱/۴۱۷، طبع بیروت)

دورِ جاہلیت۔

دور جاہلیت میں بھی جب اسلام کا نور پھیلا اور قرآن حکیم نے ظلم و زیادتی کے راستوں کو بند کرتے ہوئے ربا کی حرمت کا دوٹوک اعلان کیا تو ربا کا مفہوم جو اوپر عرض کیا گیا ہے، بالکل واضح تھا، اس لیے مشرکین اور قرآن مجید کے مخاطبین کو ربا کا مفہوم سمجھنے میں ادنی سی دقت نہ

ہوئی، البتہ کفار ومشرکین کو اس بات پر تکلیف ضرور ہوئی کہ جس ربا کا ان کے معاشرہ میں عام چلن ہے اسے حرام کیوں کیا گیا؟ اس بات پر کہ دور جاہلیت میں ربا کا یہ مفہوم واضح تھا۔ چند حوالے پیش خدمت ہیں۔

1۔ والربا الذی کانت العرب تعرفہ و تفعلہ انما کان قرض الدراہم والدنانیر الی اجل بزیادۃ علی مقدار ما استقرض علی ما یتراضون بہ،

یعنی وہ ربا جو عربوں کے یہاں معروف اور معمول بہ تھا وہ یہ کہ دراہم اور دنانیر کو ایک مدت کے لیے قرض دیا جاتا اور باہمی رضامندی کے ساتھ قرض لی ہوئی مقدار پر زیادتی طے کرلی جاتی تھی۔

(جصاص احکام القرآن ۱/۴۶۵)

۲۔ مشہور تابعی مجاہد (متوفی ۱۰۱ھ) کہتے ہیں "یکون للرجل علی الرجل دین فیقول لک زیادۃ کذا و کذا و تؤخر عنی" یعنی آدمی کا آدمی پر قرض ہوتا تھا تو وہ (قرض دار) کہتا تھا کہ تم مجھے مہلت دے دو تو میں تمہیں اتنی اتنی رقم زیادہ دوں گا۔

(تفسیر مجاہد مع تعلیق عبدالرحمٰن السورتی ۱/۱۱۷، طبع بیروت)

۳۔ علامہ طبری (متوفی ۳۱۰ھ) اپنی تفسیر جامع البیان میں لکھتے ہیں "عن مجاہد قال فی الربا الذی عنی فیؤخر عنہ" مجاہد فرماتے ہیں کہ وہ ربا جس کی اللہ تعالیٰ نے ممانعت فرمائی وہ یہ تھا کہ دور جاہلیت میں ایک ادمی کا دوسرے پر قرض ہوتا تھا وہ کہتا تھا کہ تم اتنی مزید رقم کے عوض مجھے مہلت دے دو چنانچہ وہ مہلت دے دیتا تھا۔

عن قتادہ ان ربا الجاھلیہ یبیع الرجل البیع الی اجل مسمّٰی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبہ قضاء زادہ واخر عنہ۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے ربا میں ایک آدمی دوسرے کو مدت معینہ تک کوئی چیز بیچتا تھا جب مدت پوری ہو جاتی اور قرض دار کے پاس ادائیگی کے لیے نہ ہوتا تو وہ قرض میں اضافہ کر کے مہلت حاصل کرلیتا ہے۔

(طبری جامع البیان ۳/۱۰۱، طبع دارالفکر)

۴۔ امام رازی اپنی معروف تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

اما ربا النسیہ فھو الامر الذی کان مشہورا متعارفا فی الجاھلیہ و ذالک انہم کانوا یرفعون المال علی ان یاخذوا کل شہر قدرا معینا و یکون راس المال باقیا ثم اذا حل الذین طالبوا المدیون براس المال فان تعذر علیہ الاداء زادوا فی الحق والاجل فھذا الربا الذی کانو فی الجاھلیۃ یتعاملون بہ۔

(امام رازی تفسیر کبیر، ۲/۳۵۷ مطبوعہ خیریہ)

(یعنی ادھار کا ربا وہی ہے جو زمانہ جاہلیت سے مشہور و متعارف چلا آتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا مال اس شرط پر قرض دیتے کہ اتنا روپیہ ماہوار اس کا سود دینا ہوگا اور راس المال بدستور باقی رہے گا۔ پھر جب قرض کی میعاد پوری ہو جاتی تو وہ قرض دار سے اپنا راس المال طلب کرتے، اگر قرض دار اس وقت ادا کرنے سے عذر کرتا تو وہ میعاد میں اور زیادتی کر دیتے اور اس کا سود بڑھا دیتے یہی وہ ربا ہے جس کا دور جاہلیت میں لوگ معاملہ کیا کرتے تھے۔

۵۔ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام کے مصنف اپنی کتاب کی ساتویں جلد میں دور جاہلیت میں ربا کے عام چلن کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وفی جملتہ وسائل استثمار المال الربا، و قد کان شائعا بین اھل الجاھلیۃ، کما شائعا معروفا بین غیر العرب و د عرفہ العلماء بانہ الزیادۃ علی راس المال --- و الا رباء الزیادتہ علی الشیء و الزیادۃ بی الربا و کل قرض جر منفعتہ فھو ربا۔ --- وقد کان اھل الجالیۃ یزیدون علی الذین شیئا ویوخرونہ کان یحل دینک علی رجل فتزیدہ فی الاجل و یزیدک فی الدین و قد نہی عنہ فی الاسلام وھو فی الواقع ربا --- وکان الیھود من اشہر المرابین فی الحجاز کما اشتہرت بذالک مکت والطائف و نجران، و مواضع المال الاخری من جزیرۃ العرب"۔

(دور جاہلیت میں مال کے پیداواری ذرائع میں سے ایک ربا تھا۔ ربا اہل جاہلیت (عربوں) میں اسی طرح پھیلا ہوا تھا جیسے غیر عربوں میں علماء نے ربا کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ راس المال پر اضافہ ہوتا ہے۔ ارباء کا مطلب ہے اصل چیز پر زائد وصول کرنا، اور زیادتی کا نام ربا ہے اور ہر وہ قرض جو نفع کو کھینچ کر لائے وہ ربا ہے، اہل جاہلیت کا طریقہ تھا کہ وہ قرض میں اضافہ کر کے قرض دار کو مہلت دے دیا کرتے تھے جیسے تمہارا کسی پر کوئی قرض ہو اس کی ادائیگی کی مدت آجائے تو تم مقروض کی مدت میں اضافہ کر دو جس کے عوض وہ تمہارے قرض میں اضافہ کر دے اسے اسلام نے منع کیا اور یہی رباء کی حقیقت ہے۔ یہود حجاز کے علاقہ میں مشہور سود خوار تھے اور مکہ، طائف، نجران، اور اس کے علاوہ جزیرۃ العرب کے دوسرے مالی مراکز سود کے معاملہ میں شہرت رکھتے تھے۔)

(الدکتور جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ۴۱۹/۷، ۴۲۰، مکتبہ النہضۃ بغداد)

یہی مصنف آگے چل کر لکھتے ہیں۔۔

"وقد اشتہر الیھود بمعاطاۃ الربا، قد اشیر الی ذالک فی القرآن الکریم

(سورۃ النساء الای۱ ۱۶۱) کما عرف بہ اہل مکۃ و الطائف و نجران و سائر من کان لدیہ فضل من المال واراد استغلالہ، و ذلک للظروف الاقتصادیۃ التی کانت سائدۃ فی ذالک العبد من عدم وجود صناعہ یشتغل اصحاب المال بہا اموالھم فیکثرونہا باستغلالہا بانشاء صناعات او توسیع حرف و من عدم وجود میاہ غزیرہ و ارضین خصبہ تسقی مسیجا بصورۃ دائمہ حتی یشتغل صاحب المال مالہ فی استغلال الارض ولہذا عمدا اصحاب المال الی تکثیر اموالھم بطریق اقراضہ والاستفادہ من رباء"

(یہود سودی لین دین میں مشہور تھے جس کی طرف قرآن حکیم نے (سورۃ النساء آیت نمبر ۱۶۱) میں اشارہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح اہل مکہ، اہل طائف، اہل نجران بھی سودی کاروبار میں معروف تھے اور یہی حال ان تمام لوگوں کا تھا جن کے پاس زائد مال تھا اور وہ اسے پیداواری مقاصد میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سود کے پھیلنے کی وجہ اس دور کے اقتصادی حالات تھے کیونکہ نہ تو اس زمانے میں صنعتوں کا وجود تھا جس میں سرمایہ دار اپنی رقمیں لگا کر صنعتوں اور حرفتوں میں توسیع کا کام کر سکیں اور نہ پانی کی فراوانی اور سرسبز زمینیں تھیں جن پر مال داروں کی طرف سے مستقل سرمایہ کاری کی جاسکے اس لیے سرمایہ داروں نے اپنے اموال میں اضافہ کے لیے قرض دے کر سود حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔)

(دیکھیں حوالہ مذکورہ بالا ۴۴۶/۷)

یہی مصنف مختلف حوالوں سے دور جاہلیت میں ربا کے عمومی چلن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"الربا الذی کانت العرب تعرفہ و تفعلہ انما کان قرض الدراہم والدنانیر الی احل بزیادۃ علی مقدار ما استقرضہ علی ما یتراضون بہ وان ربا الجاھلیۃ انما کان قرضا موجلا بزیادۃ مشروطۃ فکانت الزیادہ بدلا من الاجل۔"

(وہ ربا جو عربوں کے یہاں معروف تھا اور جس کا وہ لین دین کرتے تھے وہ یہ تھا کہ دراہم اور دنانیر کو ایک مدت کے لیے قرض دیا جاتا اور باہمی رضامندی کے ساتھ قرض لی ہوئی مقدار پر زائد نفع طے کیا جاتا۔۔۔ اور دور جاہلیت کا ربا معین مدت کے لیے مشروط زیادتی کے ساتھ، قرض ہوتا تھا جس میں اصل رقم پر زیادتی مدت کا بدل ہوتی تھی۔)

(دیکھیں حوالہ مذکورہ بالا ۷/۴۴۷)

یہ چند حوالے جو اوپر پیش کیے گئے یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ دور جاہلیت میں جب ربا کی ممانعت نازل ہوئی تو ربا کا مفہوم وہی معروف تھا جو اوپر عرض کیا گیا یعنی "ایک مدت کے لیے مشروط زیادتی کے بدلہ میں قرض دینا" دور جاہلیت میں یہی سود رائج تھا۔ اسی طرح کے سودی کاروبار کا رواج تھا اور اسی کی قرآن حکیم نے ممانعت کی ہے۔ اس مفہوم کے واضح ہونے میں نہ اہل لغت کو کسی قسم کا شک ہے اور نہ کفار و مشرکین کو اس ممنوع ربا کے مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت پیش آئی۔

"ربا" کا مفہوم اور احادیث و آثار:

لغات عرب، اور دور جاہلیت کے حوالہ سے ربا کا مفہوم واضح ہونے کے بعد اگر احادیث نبوی و آثار صحابہ کے حوالہ سے دیکھا جائے تو وہ بھی "ربا" کے اس مفہوم پر متفق ہیں یعنی قرض کے بدلہ میں ہر وہ اضافہ یا زائد رقم جو معاہدہ طے کر کے لی اور دی جائے۔ "ربا" ہے اور حرام ہے۔

۱۔ خطبہ حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے:۔

"الا ان کل ربا کان فی الجاھلیۃ موضوع عنکم کلہ لکم رؤوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون و اول ربا موضوع ربا العباس بن عبدالمطلب کلہ"

(ابن کثیر ۱: ۳۳۱۔ مطبوع مصر ۱۳۵۶۔ و ملحق حجۃ الوداع للدکتور حبیب الرحمٰن الاعظمی ج۔ ۳، ص۔ ۵)

(سنو کہ ہر وہ "ربا" جو ایام جاہلیت میں تھا تم سے پورے کا پورا ختم کر دیا گیا، تمہارے لیے صرف قرض کی اصل رقم ہے، نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے اور سب سے پہلے جو ربا ختم کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبدالمطلب کا ربا ہے پورے کا پورا)

معلوم ہوا کہ اصل راس المال سے زائد مشروط مال خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ "ربا" میں داخل ہے اور اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے راس المال واپس لینے کی تو اجازت دی مگر راس المال سے زائد طے شدہ ہر رقم بالکل ختم کر دی اور اس کے لین دین کی سختی سے ممانعت کر دی۔

نوٹ: یہاں در منثور کی ایک عبارت نقل کرنا بے محل نہ ہوگا، اس سے واضح ہوگا کہ حضرت عباس کے جس سود کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا وہ کس قسم کا سود تھا۔

"نزلت ھذہ الایۃ فی العباس بن عبدالمطلب و رجل من بنی المغیرۃ کانا شریکین فی الجاھلیۃ۔ یسلفان فی الربا الی ناس من ثقیف"

یعنی یہ آیت حضرت عباس اور بنو مغیرہ کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، ان دونوں کا شرکت میں کاروبار تھا اور یہ قبیلہ ثقیف کے کچھ لوگوں کو سود پر روپیہ ادھار دیا کرتے تھے۔

(السیوطی: تفسیر الدر المنثور ج۔1، ص۔۳۶۶)

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**کل قرض جر منفعتہ فھو ربا**" یعنی ہر وہ قرض جو نفع کما کر لائے وہ ربا ہے۔

(السیوطی: الجامع الصغیر ۱: ۹۴، حدیث ۶۳۲۶، مطبوعہ مصر ۱۳۵۸)

یہ حدیث چونکہ متعدد اسناد سے مروی ہے اس لیے علامہ عزیزی نے اس حدیث کو "حسن لغیرہ" قرار دیا ہے (دیکھیں العزیزی: السراج المنیر ۸۶: ۳، مطبوعہ مصر ۱۳۲۵ھ)

نوٹ: اس حدیث میں "جر" کا لفظ چونکہ معاہدہ قرض میں طے کر کے لی جانے والی زائد رقم کے مفہوم کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے، اس لیے "ربا" کی قانونی تعریف میں امام جصاص رازی نے "المشروط" کا لفظ رکھا ہے، یہ تعریف ہم اپنے مقالہ کے پہلے صفحہ پر ذکر کر آئے ہیں۔

۳۔ مشہور صحابی حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے بھی "ربا" کی یہی تعریف منقول ہے۔۔

كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا"

(البیہقی: السنن الکبری ۳۵۰/۵، مطبوعہ دکن)

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول موطا میں نقل کیا گیا ہے۔

(الف) من اسلف سلفا غلا یشرط الا قضاءہ۔ یعنی جب کسی نے کوئی قرض دیا تو اصل رقم کے علاوہ کسی زائد چیز کو شرط نہیں کیا جا سکتا۔

(ب) انہیں حضرت عبداللہ بن عمر کا واقعہ موطا میں نقل کیا گیا کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور عرض کیا کہ اے ابو عبدالرحمٰن! میں نے ایک آدمی کو قرض دیا اور قرض سے زائد کی ادائیگی میں اس کے ذمہ مشروط کر دی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا یہ تو "ربا" ہے، اس نے پوچھا کہ پھر آپ کا کیا حکم ہے حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا، قرض کی تین صورتیں ہیں:

(۱) ایک وہ قرض جو محض اللہ کے خوش کرنے کے لیے دیا جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نصیب ہو گی۔

(۲) دوسرے وہ قرض جو ساتھی کی (حاجت کو پورا کرنے اور اس کی) خوشنودی کے لیے دیا جائے تو اس صورت میں ساتھی کی خوشنودی مل جائے گی۔

(۳) تیسرے وہ قرض جسے تم دو اور اس پاکیزہ (قرض) کے ذریعے خبیث (زیادتی) حاصل کرنا چاہو تو یہ "ربا" ہے۔

(امام مالک موطا ص 613، طبع نور محمد کراچی)

معلوم ہوا کہ قرض پر مشروط زیادتی حرام اور ربا ہے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی یہی تعریف منقول ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

(الف) "من اسلف سلفا فلا یشترط افضل منہ، وان کان قبضہ من علف فھو ربا"

(یعنی جس نے کوئی قرض دیا تو اصل سے زائد مشروط نہ کرے اگر چارہ کی ایک مٹھی کا بھی اضافہ کیا تو وہ بھی "ربا" ہے)

(امام مالک: موطا: ص ۶۱۳: طبع نور محمد کراچی)

(ب) انہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ سے ایک آدمی نے آکر مسئلہ پوچھا کہ میں نے ایک آدمی سے پانچ سو درہم اس پر قرض لیے ہیں کہ میں اسے اپنا گھوڑا استعمال کے لیے عاریۃً دے دوں گا، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا، ما اصاب منہ فھو ربا۔ (یعنی جو کچھ وہ نفع اٹھائے گا وہ ربا ہے)

(بیہقی: سنن کبری: ج ۵: ص ۳۵۰)

معلوم ہوا کہ قرض پر ہر مشروط نفع "ربا" ہے چاہے وہ منافع کی شکل ہی میں ہو۔

۶۔ صحیح بخاری شریف میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو قبل از اسلام یہود کے نامور علماء میں شامل تھے) کا قول نقل کیا گیا ہے۔:

ابو بردہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے مجھے نصیحت کی کہ تم ایسی سر زمین میں آباد ہو جہاں ربا بہت عام ہے، لہٰذا اگر کسی شخص پر تمہارا قرض واجب ہو اور وہ تمہیں بھوسے، جو یا چارے کا کچھ بوجھ ہدیہ دینا چاہے تو تم اسے قبول نہ کرو کیونکہ وہ ربا ہے۔

(امام بخاریؒ، الجامع الصحیح: ا، ص ۵۳۸، مطبوعہ دہلی)

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا یہ حکم یا تو تقوی اور احتیاط پر مبنی ہے یا پھر اس قسم کے تحفہ کا عام رواج اتنا ہو گا کہ اسے معاہدے کا جزو سمجھا جانے لگا ہو گا، اس لیے فقہی قاعدہ "المعروف کالمشروط" انہوں نے اس تحفہ کو بھی "ربا" قرار دیا بہر حال اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان کے نزدیک بھی قرض پر لیا جانے والا ہر اضافہ "ربا" ہے، اگرچہ وہ "تحفہ" یا "ھدیے" کے نام سے ہو۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اس انداز کی بات ارشاد فرمائی:۔

"انما الربا اخر لی و انا ازیدک" (یعنی ربا یہ ہے کہ قرض دار یوں کہے کہ تم مجھے مہلت دے دو، میں قرض میں اضافہ کرتا ہوں۔)

(علی المتقی: کنزالعمال، ج۔4۔ ص۔ 201، طبع بیروت ۱۹۸۵ء)

خلاصہ:

لغات عرب دور جاہلیت کے حالات، اور احادیث و آثار کے ان مذکورہ بالا حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "ربا" کے مفہوم یا تعریف میں کبھی اشتباہ یا گنجلک نہیں رہی، ربا کا مفہوم ہمیشہ سے واضح چلا آ رہا ہے، یعنی "قرض پر مشروط اضافہ اور اس کی قانونی و فقہی تعریف وہ ہے جو امام ابو بکر جصاص رازیؒ نے اپنی معروف کتاب احکام القرآن میں لغات عرب اور آیات و احادیث اور آثار کی روشنی میں تحریر کی ہے کہ:

"ھو القرض المشروط فیہ الاجل و زیادۃ مال علی المستقرض"

یعنی (قرض کا وہ معاملہ جس میں ایک مخصوص مدت اور قرض دار پر مال کی کوئی زیادتی مشروط کی گئی ہو)

(الجصاص۔ احکام القرآن ا: ۵۵۷، مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ)

سود مفرد اور سود مرکب:

"ربا" کی تعریف اور اس کے مفہوم سے متعلق گذشتہ صفحات میں جتنے حوالے پیش کیے گئے ہیں ان سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرض کے بدلہ میں ہر اضافہ یا زائد رقم جو معاہدہ طے کر کے لی اور دی جائے سود میں داخل ہے۔ خواہ اس کی شرح کم ہو یا زیادہ۔۔۔ دوسرے لفظوں میں ہر سود حرام ہے خواہ وہ سود مرکب ہو یا مفرد۔ یہ بات اگرچہ سابقہ حوالوں سے پوری طرح ظاہر ہے مگر چونکہ سوالنامہ کے سوال نمبر ا میں سود مفرد اور سود مرکب کی تصریح کر کے سوال پوچھا گیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ حوالوں کے علاوہ اس سلسلہ میں مزید نکات بھی پیش کر دیے جائیں۔

ا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ **(البقرہ: ۲۷۸)**

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ربا کی جو کچھ مقدار رہ گئی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو)

۲۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَلا تُظْلَمُونَ **(البقرہ: ۲۷۹)**

(اگر تم توبہ کرو تو تمہاری (قرض کی) اصل رقم تمہارا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے)

ان دونوں آیتوں میں ربا کی تمام رقم چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے، نیز تنبیہ کی گئی ہے کہ ربا کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کو صرف قرض کی اصل رقم (راس المال) واپس ملے اس سے زائد کچھ نہیں۔ دوسری آیت میں "لاتظلمون ولاتظلمون" کے ذریعے اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اصل رقم پر ہر اضافہ خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو قرآن کی نظر میں ظلم ہے۔ چنانچہ حضرت قتادہ بن دعامہ دوسی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "ماکان لھم من دین فجعل ان یاخذوا رؤوس اموالھم ولایزدادوا علیہ شیئا۔" یعنی جس شخص کا کچھ قرض دوسرے پر ہو اس کے لیے قرآن نے اصل رقم لینے کی اجازت دی لیکن اس پر ذرا بھی اضافہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

(ابن جریر: جامع البیان ۳: ۶۷، مطبوعہ مصر)

۶۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے۔

"الا ان کل ربا کان فی الجاھلیۃ موضوع عنکم کلہ، لکم رؤوس اموالکم لاتظلمون ولاتظلمون، اول ربا موضوع رباالعباس بن عبدالمطلب کلہ"

(سنو ہر وہ ربا جو ایام جاہلیت میں واجب تھا تم سے پورے کا پورا ختم کر دیا گیا، تمہارے لیے صرف قرض کی اصل رقم ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اور سب سے پہلے جو ربا ختم کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبدالمطلب کا ربا ہے، پورے کا پورا)

(ابن کثیر: ا۔1 ۳۳، اور ملحق حجۃ الوداع: ص ۳۔۵)

اس حدیث سے بالکل واضح ہے کہ اصل راس المال سے زائد ہر سود اسلام میں ختم کر دیا گیا ہے چاہے وہ سود کم ہو یا زیادہ ہو، مفرد ہو یا مرکب۔

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "کل قرض جر منفعۃ فھو ربا" (جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں) بتاتی ہے کہ قرض پر کمایا جانے والا ہر نفع مطلقاً حرام ہے، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، مفرد ہو یا مرکب۔

۵۔ صحابہ کرام سے "ربا" کی تعریف میں جتنے اقوال ہم نے پیچھے نقل کیے ہیں۔ (دیکھیں احادیث و آثار میں حوالہ نمبر ۴، ۳ الف، ۴ ب، ۵ الف، نمبر ۵ ب، نمبر ۶) وہ سب اور اس کے علاوہ مفسرین محدثین، ائمہ، اور فقہاء اسلام کی تمام عبارات اس بات پر گواہ ہیں کہ اسلام میں مطلقاً ہر سود حرام ہے۔ تھوڑے سود یا زیادہ سود، مفرد یا مرکب سود کا فرق اسلام میں کسی عالم نے نہیں کیا، سب کے نزدیک قرض پر

متعین ادنی سود بھی "ربا" میں داخل اور حرام ہے۔ بلکہ اہل تقویٰ کے نزدیک کے لیے اس سے بھی پرہیز کرتے تھے اس کی ایک مثال حضرت عبداللہ بن سلام کے حوالہ سے (حوالہ نمبر ۶ میں) گذر چکی ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے ایک مثال درج ذیل ہے:۔

(ایک شخص کے کسی پر بیس درہم واجب تھے، مقروض اس کے پاس بار بار مختلف تحفے لاتا رہا، قرض خواہ ہمیشہ ان تحفوں کو بیچ دیتا، یہاں تک کہ تحفوں کی قیمت تیرہ درہم تک پہنچ گئی، قرض خواہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے کہا، اب تم اس سے سات درہم سے زائد نہ لینا)

(البیہقی: السنن الکبری: ج۵، ص۳۵۱، دائرۃ المعارف دکن)

ایک شبہ اور اس کا جواب:

حال میں بعض لوگوں کو سورہ آل عمران کی آیت "لاتاکلوا الربا اضعافا مضاعفۃ" (سود کو چند در چند کر کے مت کھاؤ) (آل عمران: ۱۳۰) سے سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ قرآن نے صرف اس سود کو حرام قرار دیا ہے جو چند در چند ہو کر اصل رقم سے بڑھ جائے اور اگر سود کی مقدار اور اس سے کم ہو تو وہ جائز ہے۔

حالانکہ دراصل اس آیت میں سود کی بنیادی کیفیت اور ایک خاص صورت بیان ہے، جو زمانہ جاہلیت میں بکثرت رائج تھی، لہٰذا "چند در چند" کا لفظ حرمت سود کی قانونی شرط نہیں ہے بلکہ اس جرم کی صرف ایک قبیح ترین صورت پر تنبیہ ہے۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن حکیم میں ارشاد ہے "لاتشتروا بایاتی ثمنا قلیلا" میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت لے کر فروخت نہ کرو (البقرۃ: ۴۱) ظاہر ہے کہ یہاں "تھوڑی سی قیمت" ممانعت کی قانونی شرط نہیں ہے، چنانچہ کوئی معقول آدمی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ آیات الٰہی کو بڑی قیمت کے عوض فروخت کرنا جائز ہے، اس کے بجائے محض جرم کی شناعت کو واضح کرنے لیے لائے گئے ہیں، بعینہٖ یہی معاملہ "اضعافا مضاعفۃ" کا ہے، کہ جرم کی شناعت بیان کرنے کے لیے ایک خاص صورت ذکر کر دی گئی ہے۔

ورنہ اگر یہ قانونی شرط ہوتی تو سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۸، میں یہ نہ کہا جاتا کہ "ربا" کی جو کچھ مقدار رہ گئی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اور آیت 279 میں یہ نہ کہا جاتا کہ "ربا" سے توبہ کی صورت میں صرف راس المال قرض خواہ کو ملے گا اور ساری رقم اسے چھوڑنی ہو گی۔

سورہ آل عمران کی اس آیت کا صحیح مفہوم وہی ہے جو اوپر عرض کیا گیا یہی قرآن حکیم کی باقی آیات اور احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے اور اسی کی تشریح تمام مفسرین نے کی ہے۔

دیکھیں:۔

۱۔ احکام القرآن ج۔ا ص ۴۶۵، (جصاص)

۲۔ تفسیر ابی السعود، ج ۷۔ ص ۸۴،

۳۔ ابو حیان: البحر المحیط، ج ۳۔ ص ۸۴،

۴۔ الشوکانی: فتح القدیر، ج ا۔ ص ۳۸۱ وغیرہ۔

نوٹ:۔ نا مناسب نہ ہو گا اگر ہم مذکورہ بالا آیت میں "اضعافا مضاعفۃ" کی قید کا فائدہ سمجھنے کے لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی عبارت نقل کر دیں۔ موصوف اپنی کتاب "مسئلہ سود" میں لکھتے ہیں:

"جاہلیت عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی اس لیے اس میں اضعافا مضاعفۃ یعنی کئی حصے زائد فرما کر ان کے مروجہ طریقے کی مذمت اور ملت کشی و خود غرضی پر متنبہ فرما کر ممنوع قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ "اضعاف مضاعف" نہ ہو تو حرام نہیں کیونکہ سورہ بقرہ اور نساء میں مطلّقا ربوا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے۔ اضعاف و مضاعف ہو یا نہ ہو۔ اگر سود کے مروجہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب سود خوری کی عادت پڑ جائے تو پھر سود تنہا سود نہیں رہتا بلکہ لازما اضعاف و مضاعف ہو جاتا ہے کیونکہ جو رقم سود سے حاصل ہو کر سود خوار کے مال میں شامل ہوئی، اب سود کی اس زائد رقم کو بھی سود پر چلایا جائے گا، تو سود مضاعف ہو جائے گا، اس طرح سود "اضعاف مضاعف" بن کر رہے گا۔ علاوہ ازیں جب سودی کاروبار میں اصل قرض بدستور باقی ہے اور میعاد کا سود لیا جا رہا ہے تو ایک زمانہ کے بعد ہر سود راس المال کا "اضعاف و مضاعف ہو جائے گا"

(مفتی محمد شفیع: مسئلہ سود، ص: ٦۔ ٦٣، طبع کراچی، ١٣٩٩ھ)

سود مفرد اور سود مرکب کا فرق عقل کی نظر میں:

دراصل سود مرکب اور سود مفرد کی تفریق صرف ان لوگوں نے پیدا کی ہے جو سود کو بہر حال اقتصادی نظام میں جاری رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو سود مفرد اور سود مرکب میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ سود مفرد پر مفرد سود لگایا جائے تو سود مرکب بن جاتا ہے۔ شاید ان لوگوں کی مراد یہ ہو کہ سود مفرد مناسب سود ہے اور سود مرکب غیر مناسب۔ مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ادارہ کا سود مفرد اتنا زیادہ ہو کہ دوسرے اداروں کے سود مرکب سے بھی بڑھا ہوا ہو۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس فرق سے ایک کے مناسب ہونے اور دوسرے کے نامناسب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک ادارہ کا سود مرکب دوسرے ادارہ کے سود مفرد سے بھی کم ہو اور دونوں کو مناسب قرار دے دیا جائے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سود مفرد اور سود مرکب میں پھر فرق ہی کیا ہے؟ موجودہ دنیا میں اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں کہ کسی ملک کے ایک ادارے کی شرح دوسرے ادارے کی شرح سود سے بہت زیادہ ہے حالانکہ یہ دونوں ادارے ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر ایک ہی قسم کے قرضے جاری کر رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ایک پرائیویٹ ساہوکار اپنے مقروض سے چوبیس سے سو فیصد تک، فنانس کمپنی تیس سے چھتیس فیصد تک، اور ایک بنک پانچ سے آٹھ فیصد تک سالانہ سود وصول کر سکتا ہے، یہ عین ممکن ہے کہ ایک ہی قرضدار ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کے قرضوں کے لیے ایک فنانس کمپنی کو چھتیس فیصد اور ایک بینک کو آٹھ فیصد کے حساب سے سود ادا کرے اور قانون دونوں کو "مناسب" تسلیم کرلے۔ یہ بات بہت ہی عجیب ہے کہ بینک تو آٹھ فیصد سے زائد وصول نہیں کر سکتا لیکن فنانس کمپنی چھتیس فیصد بھی اگر وصول کرلے تو قانون کی حدود کے اندر سمجھی جاتی ہے۔ یہ تقابل ہی صاف بتلاتا ہے کہ سود مفرد اور سود مرکب میں فرق روا رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی معیار نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی حرمت سود کے بارے میں نہایت ہی واضح ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سود کی تفریق ملحوظ ہر گز نہیں ہے۔ سود خواہ وہ ذاتی قرضوں کا ہو یا تجارتی قرضوں کا بینک کا سود ہو یا مہاجن کا، سود مرکب ہو یا مفرد اسلام نے ہر قسم کے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

خلاصہ:

مذکورہ بالا تصریحات اور حوالہ جات نے ربا کے مفہوم میں کوئی گنجلک یا ابہام واجمال باقی نہیں چھوڑا اور ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کے معاملہ میں قرض دار کے ذمہ اصل پر جو اضافہ بھی ہو معاہدہ میں طے کر کے لیا اور دیا جائے وہ ربا ہے۔ اس میں کم یا زیادہ مفرد یا مرکب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہی قرآن و سنت کا حکم ہے، یہی اجماع امت کا فیصلہ ہے اور اسلامی شریعت میں اس کے سوا کسی نظریہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس لیے سوال نمبر ا، کے دوسرے جزو کا جواب واضح ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق ربا کی تعریف دور جدید کے مالیاتی معاملات کے سود مفرد اور سود مرکب پر یقینا مشتمل ہے۔ اس میں کوئی اشتباہ نہیں۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب،
چیئر میں، شعبہ اسلامیات۔ پشاور یونیورسٹی، پشاور۔

1۔ قرآن و سنت کی رو سے ربا اور اس کی تمام صورتیں ممنوع ہیں۔

(الف)۔ یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا۔ (۲:۲۷۸)

(ب)۔ یا ایہا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ" (۳:۱۳۰)

(ج)۔ الذین یاکلون الربو لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من المس ذلک بانہم قالوا انما البیع مثل الربوا۔ واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔ (۲:۲۷۵)

"وان کل ربا من ربا الجاھلیۃ موضوع لکم رؤوس اموالکم" (ابن ماجہ۔ ابواب مناسک)

ربا کے لغوی معنی:

(الف)۔ الربا ربوان والمراد کل قرض یوخذ بہ اکثر منہ او یجر بہ منفعتہ۔ (لسان العرب۔ ۱۹۔۱۷)

(ب)۔ "ھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ المال علی المستقرض" (احکام القرآن۔ جصاص۔ ۱۔۵۵۷)

(د) "الربا فی الشرع عبارۃ عن فضل مال لا یقابلہ عوض فی معاوضۃ مال بمال " (روح المعانی۔ ۳۔۴۲)

مندرجہ بالا معانی کے تحت ربا کا اطلاق سود مفرد اور سود مرکب دونوں پر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایام جاہلیت میں نجی اور اجتماعی کاروبار میں سودی لین دین کو مذکورہ آیات کے نزول کے بعد حرام قرار دیا گیا تھا:

(۱)۔ در منثور۔ ۲۔ ۳۶۴

(۲)۔ معارف القرآن ا۔ ۶۵۴

(۳)۔اشتراکیت اور سرمایہ داری کا اسلام سے موازنہ۔ ۷۷

سعید معروف شاہ شیرازی صاحب۔

گاؤں وڈاکخانہ چنار کوٹ براستہ بٹل، تحصیل و ضلع مانسہرہ۔

قرآن میں حرمت ربا کے احکام کا نزول

دوسرے احکام کی طرف قرآن مجید میں حرمت ربا کے احکام بھی ایک تدریج کے ساتھ نازل ہوئے اور اس کے بارے میں آخری حکم یہ آیا کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

۱۔ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلا يَرْبُو عِنْدَ اللَّهِ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (۳۰:۳۹)

اور جو سود تم دیتے ہو تا کہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا اور جو زکوۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو اسی کے دینے والے در حقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔

یہ آیات ہجرت حبشہ کے وقت نازل ہوئیں، اس وقت سود کے خلاف صرف یہ بتایا گیا کہ سودی کاروبار سے اصل غرض و غایت مال کو بڑھانا ہے اور اسی لیے اس پر ربا کا اطلاق کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی بڑھنے اور بڑھانے کے ہیں تو در حقیقت اس معاشی عمل سے مال میں اضافہ نہیں ہوتا سودی نظام سے مال صرف دولت مندوں کے ہاں جمع ہو جاتا ہے اور اس کی پیداواری صلاحیت میں کمی ہوتی ہے۔ در اصل زکوۃ کا نظام مالی اور معاشی ترقی کا نظام ہے لہٰذا معاشی سرگرمیوں کو نظام زکوۃ پر استوار کرو۔

۲۔ دوسرے مرحلے میں سورۃ نساء کی آیات ۱۶۰ اور ۱۶۱ نازل ہوئیں:

فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا (١٦٠)وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴: ۱۶۰۔۱۶۱)

(غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بناپر، اور اس بناپر کہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کردیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس دوسرے مرحلے میں یہودیوں پر ایک تاریخی تبصرہ کیا گیا اور اس میں اس طرف اشارہ دیا گیا کہ کتب سابقہ میں بھی سود کو حرام کیا گیا تھا اور یہودیوں کے بڑے جرائم میں سے یہ جرم بھی تھا کہ وہ سودی کاروبار کرتے تھے۔

تورات میں اسے ان الفاظ میں حرام قرار دیا گیا تھا:

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔" (۲۲/۲۵)

اور آیت نمبر ۱۶۲ میں یہ اشارہ کردیا گیا کہ جو لوگ ٹھوس علم و کردار کے مالک ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور پہلی کتابوں کی ہدایات کو بھی مانتے ہیں لہٰذا اسلام کی نظر میں بھی ربا ناپسندیدہ امر ہے۔

۳۔ تیسرے مرحلے میں سورت آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۰ آتی ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لأولِي الأبْصَارِ (١٣)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

اور اس کے بعد دوسری آیات میں کہا کہ جہنم کی آگ سے ڈرو اور اللہ کی مغفرت کے لیے سعی کرو اور ہر حال میں دولت جمع کرنے کی بجائے خرچ کرو، یہ ہے اسلامی پالیسی اور اسی میں تمہاری فلاح اور یہی راہ احسان ہے۔

دور جدید کے بعض حضرات نے لفظ اضعافا مضاعفۃ) پر بہت زور دیا ہے اور انہوں نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ عقد سود میں اگر شرح ظالمانہ نہ ہو اور مرکب سود نہ ہو اور اس سے رب المال کو بہت زیادہ منافع نہ ملتا ہو تو اس کی ممانعت نہیں، لیکن یہ تفسیر حرمت سود اور حرمت شراب کی تدریجی حرمت سے بے خبری کی علامت ہے، حرمت سود کی آخری ہدایات سورۃ بقرہ کی آیات ۲۷۵ میں آئی ہیں۔ کیا ہم آیت (یا ایہا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاری) سے یہ اخذ کرسکتے ہیں کہ شراب صرف اوقات نماز میں حرام ہے؟

دراصل (اضعافا مضاعفۃ) میں حرمت سود کی اصل علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سود کی حرمت صرف اس لیے ہے کہ اس میں "فضل" لیا جاتا ہے لیکن وہ بلا بدل ہوتا ہے اور محض مدت کے بدلے لیا جاتا ہے۔ اگر اضعاف مضاعفۃ سے مراد محض زیادتی ہوتی تو تجارت کے ذریعے بھی شریعت بہت زیادہ منافع کمانے پر پابندی لگا دیتی۔ اور منافع کو بھی ایک نسبت میں محدود کردیا جاتا، لہٰذا شریعت یا جدید معاشی اصولوں کے مطابق بھی منافع کی زیادہ یا قلیل شرح کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اصل اہمیت "فضل" بمقابلہ مدت یا فضل بلا مقابلہ کی ہے۔

۴۔ اب سود کے بارے میں حیات نبوی کے بالکل آخری دور میں سورۃ بقرہ کی آخری ہدایات آتی ہیں۔ ان میں سودی نظام کے بارے میں آخری احکام اور مکمل فلسفہ بیان کیا گیا ہے:

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لا يَقُومُونَ إِلا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (٢٧٥)يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ (٢٧٦)إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ (٢٧٧)يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (٢٧٨)فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَلا تُظْلَمُونَ **(۲۷۹)**

جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے تو آئندہ سے وہ سود خواری سے باز آ جائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا، اللہ سود کا متھا مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا، ہاں جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں، ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے، اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہار سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے حقدار ہو، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔)

ان آیات سے قبل انفاق کا حکم دیا گیا تھا اور ان آیات کے بعد یہ کہا گیا کہ قرض دار کو یا تو قرضہ معاف کر دو یا پھر اس کے حالات درست ہونے تک مہلت دو، یہ نہ کرو کہ مہلت کے عوض اس سے مزید مال وصول کرو۔

ان تمام آیات میں قرآن ہمیں جو سوچ اور ذہنیت عطا کرتا ہے اور جو پورے قرآن میں بھی نظر آتی ہے وہ ہے:

۱۔ معاشی نظام اور معاشی معاملات میں ظلم کا عنصر نہیں ہونا چاہیے۔ لاتظلمون ولا تظلمون۔ کسی بھی فریق پر ظلم نہ ہو۔

۲۔ یہ کہ انسان کو وہی ملنا چاہیے جس کے لیے اس نے سعی کی ہے اور اسے کوئی چیز بلا بدل نہ ملنا چاہیے۔ لیس للانسان الا ما سعی۔

۳۔ یہ کہ ربا کی حرمت کا اصل سبب زیادتی ہے، اس لیے اسے ربا سے تعبیر کیا گیا اور فقہاء اسے فضل سے تعبیر کرتے ہیں۔

۴۔ یہ کہ اسلامی معاشی نظام میں عوامی ترقی مطلوب ہے، انفرادی ترقی کو نظر انداز کیا گیا ہے، ورنہ سود نواز انفرادی طور پر تو ترقی کرتا ہے لیکن چونکہ اجتماعی ترقی کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی ترقی کو شریعت نے (محق) سے تعبیر کیا ہے اور حدیث میں اسے (قل)

۵۔ سود خواری سے روپیہ جمع ہوتا ہے، جب کہ اسلام دولت کی گردش چاہتا ہے اور بچت کے بجائے انفاق کی تبلیغ کرتا ہے۔

۶۔ اسلام کی معاشی پالیسی اور افراد کے لیے مالی روابط کے سلسلے میں پالیسی یہ ہے کہ اس میں عفو و درگزر سے کام لیا جائے، یہ نہ ہو کہ قرض دار کی مہلت کو بھی اس پر فروخت کیا جائے۔

ربا۔۔سنت رسول کی روشنی میں

(ا)۔۔۔حرمت کے بارے میں شدید وعید

عن جابر رضی اللہ عنہ: قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ و قال ھم سواء۔ (مسلم)

(حضرت جابر سے روایت ہے، فرماتے ہیں لعنت فرمائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، لکھنے والے پر اور دونوں گواھوں پر اور فرمایا وہ سب برابر ہیں)

عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لیاتین علی الناس زمان لا یبقی احد الا اکل الربا فان لم یاکلہ اصابہ من بخارہ و یروی من غبارہ۔ **(احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)**

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ کوئی ایسا نہ رہے گا جس نے سود نہ کھایا ہو، اگر کوئی ایسا ہو کہ اس نے سود نہ کھایا ہو تو اس کا بخار اس تک ضرور پہنچا ہو گا، بعض روایات میں غبار کا لفظ آیا ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتیت لیلۃ اسری بی علی قوم بطونہم کالبیوت فیھا الحیات تری من خارج بطونہم فقلت من ھؤلاء یا جبریل؟ قال ھؤلاء اکلہ الربا۔ **(احمد، ابن ماجہ)**

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس وقت مجھے معراج کی سیر کرائی گئی اس رات مجھے کچھ لوگ دکھائے گئے جن کے پیٹ کھروں جیسے تھے جن میں سانپ تھے اور ان کے پیٹوں میں سے باہر نظر آرہے تھے، میں نے پوچھا، جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ سود کھانے والے ہیں)

عن عبداللہ ابن حنظلیہ غسیل الملائکۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درہم ربا یاکلہ الرجل و ھو یعلم اشد من ستۃ وثلاثین زنیۃ۔ **(احمد)**

حضرت عبداللہ ابن حنظلہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود کا ایک روپیہ جو شخص جانتے ہوئے کھائے گا وہ ۳۶ مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ برا ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الربا سبعون جزاء ایسرھا ان ینکح الرجل امہ۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ربا کے ستر اجزاء ہیں اور ان میں سے آسان ترین اس قدر گھناؤنا ہے جس طرح کوئی اپنی والدہ سے نکاح کرے۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو اقرض الرجل الرجل فلایاخذ الھدیۃ **(تاریخ بخاری)**

حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی شخص دوسرے کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔

(۲)۔احادیث میں دی ہوئی تمثیلات و نظائر

عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء یدا بید فاذ اختلف ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یدا بید۔ (مسلم)

حضرت عبادہ ابن الصامت سے روایت ہے کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونا سونے کے بدلے، چاندی، چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے ساتھ اور نمک نمک کے ساتھ برابر برابر، پورا پورا اور دست دستی کا فروخت ہوگا اگر اجناس مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ تبادلہ دستی ہو۔

۲۔ عن ابی سعید الخدری قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر، والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل یدا بید فمن زاد واتزاد فقد اربی الاخذ والمعطی فیہ سواء۔ (مسلم)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سونا سونے کے ساتھ، چاندی چاندی کے ساتھ، گندم گندم کے ساتھ، جو جو کے ساتھ، کھجور کھجور کے ساتھ، نمک نمک کے ساتھ، برابر برابر اور دست دستی (فروخت ہوں گے) جس نے زیادہ کھایا یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود کھایا۔ سود کے معاملے میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں)۔ (اس حدیث کی بعض روایات میں الاوزنا بوزن کا لفظ آتا ہے)

3۔ وعن ابو سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الذھب بالذھب الا مثلا ولا تشفوا بعضا علی بعض ولا تبیوعا الورق بالورق الا مثلاً ولا تشفوا بعضہا علی بعض ولا تبیعوا منھا غالبا بفاجز۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کو سونے کے عوض فروخت نہ کرو، الا یہ کہ برابر برابر وزن ہو، اور دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر زیادہ نہ کرو، چاندی کو چاندی کے عوض فروخت نہ کرو، الا یہ کہ دونوں کا وزن برابر ہو اور کسی ایک کو دوسرے پر زیادہ نہ کرو، ان میں سے حاضر موجود کو غائب غیر موجود کے عوض بھی فروخت نہ کرو۔

4۔ عن معمر بن عبداللہ قال کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الطعام بالطعام مثلا بمثل۔ (مسلم)

(معمر کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنتا رہتا تھا کہ خوراک خوراک کے بدلے برابر برابر فروخت ہو گی)

۵۔ و عن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب ربا الاھاء والورق بالورق رباھاء وھاء والبر بالبر ربا الاھاء وھاء والشعیر بالشعیر ربا الاھاء وھاء والتمر بالتمر ربا الاھاء وھاء۔ (متفق علیہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے سونا سونے کے بدلے ربا ہے الا یہ کہ دست بدست ہو، چاندی چاندی کے بدلے ربا ہے الا یہ کہ دست بدست تبالہ ہو، گندم گندم کے ساتھ ربا ہے الا یہ کہ دست بدست تبادلہ ہو، جو جو کے ساتھ ربا ہے الا یہ کہ تبادلہ دست بدست ہو، کھجور کھجور کے ساتھ ربا ہے الا یہ کہ تبادلہ دست بدست ہو۔

۶۔ عن عبادۃ ابن الصامت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تبیعوا الذھب بالذھب ولا الورق بالورق ولا البر بالبر ولا الشعیر بالشعیر ولا التمر بالتمر والملح بالملح الا سواء بسواء عینا بعین یدا بید ولکن بیعوا الذھب بالورق والورق بالزھب والبر بالشعیر والشعیر بالبر والتمر بالتمر والملح بالمح یدا بید کیف شئتم (روایت شافعی)

۷۔ و عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال التمر بالتمر والحنطۃ بالحنطۃ والشعیر بالشعیر والملح بالملح مثلا بمثل یدا بید فمن زاد واستزاد فقد اربی الا ماختلف الوانہ۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کھجور کے ساتھ گندم گندم کے ساتھ، جو جو کے ساتھ، نمک نمک کے ساتھ برابر برابر دست بدست فروخت ہو گا، پس جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود کیا الا یہ کہ جن چیزوں کا رنگ بدل جائے۔

۸۔ و عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الذھب بالذھب وزنا بوزن مثلا و الفضہ بالضۃ وزنا بوزن مثلا بمثل۔ (احمد، مسلم، نسائی)

حضرت ابوہریرہ حضور صلی اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا سونا سونے کے بدلے ہم وزن اور ہم مثل ہو گا اور چاندی چاندی کے بدلے ہم وزن و ہم مثل ہو گی۔

9۔ عن الحسن عن عبادۃ و انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما وزن مثل بمثل اذا کان نوعا واحدا وما کیل فمثل ذالک فاذا اختلف فلا باس بہ۔ (دار قطنی)

حسن عبادہ اور انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چیز وزن کی جاتی ہو اور نوع ایک ہو تو برابر برابر ہو گی اور جو پیمانے سے ناپی جائے تو بھی اسی طرح ہو گی اور جب دو چیزوں کی نوع مختلف ہو تو کوئی حرج نہیں۔

ربا کے بارے میں فقہاء کی آراء

ربا کے بارے میں فقہاء کی آراء میں بڑا اختلاف و اضطراب ہے اور اس اضطراب کی اصل وجہ یہ ہے کہ درج بالا احادیث پر غور و فکر کرنے کے بعد فقہاء نے حرمت ربا کی اصل علت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس علت کے تعین ہی کے نتیجے میں جب انہوں نے قیاس شروع کیا تو مختلف لوگ متضاد نتائج تک پہنچے۔ چنانچہ ایک فقیہ اور مکتب فکر کے نزدیک ایک معاملہ ربا قرار پایا اور دوسرے مکتب کے نزدیک وہ ربا سے پاک رہا۔ بہر حال فقہاء کے درمیان درج ذیل امور پر اتفاق ہے کہ :

۶۔ یہ کہ موجودہ دور کا سودی نظام رباء النسیہ ہے، اور یہ بالاتفاق حرام ہے۔ آج دنیا کے تمام بینک ماہوار یا سالانہ شرح پر متعین سود دیتے ہیں اور اسی طرح بینک جن لوگوں کو قرض دیتے ہیں وہ بھی متعین شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔ بین الاقوامی ادارے اور تمام اقوام سود ہی پر متعین شرح کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں اور تمام علماء امت کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف

نہیں ہے کہ درہم و دینار اگر قرض دیے جائیں اور ان پر متعین سود لیا جائے تو یہ ربا ہے۔ لہٰذا فقہاء کے درمیان اس بارے میں بھی کلیۃ اتفاق ہے کہ سونے چاندی اور کرنسی میں تفاصیل کے ساتھ کوئی حالیہ تبادلہ کرنا یا مستقبل میں کوئی تبادلہ کرنا یا کسی قسم کے قرض پر سود لینا حرام ہے۔

۲۔ اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ ہم جنس دو مقداروں میں ربا کا اطلاق ہوگا اور ان کا مساوی ہونا ضروری ہے اور ایک جنس کی دو مقداروں میں اچھے برے اور کوالٹی کا اعتبار نہ ہوگا۔ لہٰذا جنس تمام فقہاء کے درمیان بالاجماع علت کا ایک حصہ ہے یعنی حرمت سود کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ فقہاء کے درمیان جن امور میں اختلافات ہیں دور جدید میں ان کی کوئی عملی اہمیت نہیں ہے اس لیے کہ انہوں نے اجناس کے جن تبادلوں سے نتائج اخذ کیے وہ سارے دور جدید میں عملا نہیں ہوتے۔

(ا)۔ پہلا اختلاف یہ ہے کہ آیا احادیث میں مذکورہ چھ اجناس کے علاوہ دوسرے اجناس میں بھی سودی تبادلہ تصور ہوگا یا نہیں؟ آیا کسی دوسری جنس میں تبادلے کی کوئی صورت اگر ہو تو کیا یہی شرائط ہوں گی کہ متبادل اجناس برابر ہوں اور تبادلہ بھی فی الفور ہو۔ احادیث میں جن اجناس کا ذکر ہوا ہے وہ یہ ہیں گندم، جو، سونا، چاندی، کھجور اور نمک۔ حضرت قتادہ، طاؤس، عثمان بتی، ابن عقیلی حنبلی اور تمام ظاہریہ اس طرف گئے کہ ان چھ اجناس کے علاوہ کسی اور جنس کی دو مقداروں کا تبادلہ تفاضل کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کی رائے اس لیے درست نہیں ہے کہ آج کل ان اجناس میں سے کسی ایک جنس کا بھی عملا تبادلہ کسی جگہ نہیں ہوتا۔ اگر ربا الفضل کے لیے کوئی علت یا اصول اخذ نہ کیا جائے تو پھر گویا دنیا سے ربا الفضل خود بخود ختم تصور ہوگی۔ لہٰذا ان احادیث سے علت اخذ کر کے کسی اصول کا تعین ضروری ہے۔

امام ابو حنیفہ اس طرف گئے ہیں کہ ربا کے اطلاق کے لیے ایک حصہ علت تو اتحاد جنس ہے اور جس پر اتفاق ہے لیکن دوسرا جزء کسی چیز کا وزن یا پیمانے سے تولا اور ناپا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اشیاء کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے بعض وزنی ہیں اور بعض ایسی ہیں جنہیں پیمانوں سے ناپا جاتا ہے لیکن بعض میں الدرہم بالدرھمین اور بعض میں الدینار بالدینار بھی آیا ہے جن کا تعلق شمار سے ہے لیکن مذاھب اربعہ میں سے کسی نے بھی شمار سے فروخت ہونے والی اشیاء میں ربا کو جاری نہیں کیا مثلا ایک غلام کے بدلے دو غلام، ایک بیل کا سودا دو بیلوں اور ایک سیب کو دو سیبوں کے بدلے بیچا جا سکتا ہے۔ ایک روایت میں امام احمد بھی یہی رائے رکھتے ہیں لہٰذا (الدر والدریمان) درھمان کے ذکر غرض عدد نہیں بلکہ فضل ہے۔

لیکن امام شافعی، سعید بن المسیب اور ایک روایت میں امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ علت کے متفق علیہ جز اتحاد جنس کے ساتھ دوسری شرائط یہ ہیں جو اجناس وزن، یا پیمانے سے فروخت ہوتی ہوں اور ان کا تعلق کھانے پینے کی چیزوں سے ہو اگرچہ سونا اور چاندی کھانے پینے والی اشیاء نہیں ہیں لیکن وہ چونکہ اثمان ہیں اور ان سے سکے جاری ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں ربا جاری ہوگی چنانچہ ان کے نزدیک چونے اور لوہے وغیرہ ایسی اجناس ہیں جو سونے اور چاندی اور مطعومات کے علاوہ ہیں ربا کا اطلاق نہیں ہوتا جب کہ احناف کے نزدیک ان پر ربا کا اطلاق ہوتا ہے۔

ربا کے بارے میں قرآن و سنت کے نصوص کو فقہاء نے جب اپنے زمانے کے حالات پر منطبق کیا تو انہوں نے ان اصولوں اور مسائل کا استخراج کیا جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔ آج ہم جس دور میں رہتے ہیں اس میں تجارتی سکوں اور کرنسیوں کے حالات اور اقدار بدل گئے ہیں۔ مارکیٹ کے حالات بھی بدل گئے ہیں، کرنسی کی قیمت کا تعین اب صرف سونے کی قیمت سے نہیں ہوتا اور مارکیٹ میں جو نوٹ گردش کر رہے ہیں وہ سونا تصور نہیں ہوتا۔

اگر ہم قدیم فقہاء کے متعین کردہ قواعد ہی کی روشنی میں اس مسئلے کو حل کرنے کی سعی کریں گے تو مثلاً امام شافعی کا مسلک یہ تھا کہ غیر سکیل اور غیر موزوں اشیاء جن میں طعم نہ ہو اور امام مالک کے نزدیک ان کا ذخیرہ بھی نہ ہو سکتا ہو تو اس کے سودوں میں تفاضل بھی جائز ہے اور نساء بھی جائز ہے۔ وہ چونے اور لوہے میں تفاضل جائز سمجھتے ہیں۔

البتہ امام شافعی نے سونے چاندی کے لیے جو ثمن ہونے کی علت بیان کی ہے وہ درست ہے۔ دور جدید میں جس چیز کو بھی ثمن یا کرنسی قرار دیا جائے اس کا حکم سونے اور چاندی کا ہوگا۔

سونے چاندی کا ذکر اجناس میں بھی کیا گیا ہے لیکن در حقیقت وہ کرنسی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سونا چاندی بطور کرنسی رائج تھے اور جو درہم و دینار گردش کرتے تھے وہ اصل چاندی تصور ہوتے تھے اور اسی دور میں چونکہ ایرانی، رومی، اور دوسرے درہم و دینار سب رائج تھے جن کے وزن مختلف ہوتے تھے۔ اس لیے صرافہ میں کرنسیوں کا تبادلہ وزن سے ہوتا تھا اور دیہاتوں میں جہاں کرنسیوں کی کمی ہوتی تھی۔ لوگ اجناس کا تبادلہ براہ راست بھی کرتے تھے خیبر کی کھجوروں کے بارے میں حدیث شریف میں ہے۔

ان رسول الله استعمل رجلا على خيبر فجاء بتمر جنيب فقال اكل تمر خيبر بكذا فقال لا والله يا رسول الله صلى الله عليه وسلم انا ناخذ الصاع من هذا بالصاعين بالثلاث فقال التفعل بع الجمع بالدراہم ثم ابتع بالدراہم جنيبا۔ (متفق عليه)

حضرت ابو سعید اور ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص کو خیبر میں نے عامل مقرر فرمایا تو وہ اچھی قسم کی کھجوریں لے کر آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہیں؟ تو اس نے جواب دیا نہیں، خدا کی قسم ایسی نہیں، بلکہ ہم تو ان کھجوروں کا ایک صاع دو صاع کے بدلے لیتے ہیں، اور دو صاع تین صاع کے بدلے لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایسا نہ کرو تمام کھجوروں کو روپے کے عوض دے دو، اور پھر روپے سے یہ کھجوریں خریدو۔

یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں الفضہ بالفضہ وزنا بوزن بھی آیا ہے۔

چنانچہ یہ بات قرین قیاس نہیں لگی کہ حضور نے ان اشیاء کا ذکر محض مطعومات میں سے ہونے کی وجہ سے کیا، اصل بات یہ ہے کہ سونا اور چاندی دوسری اجناس کے لیے معیار تبادلہ تھے اور خود ان کا صرف وزن سے ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر تفاضل اور نسیئ دونوں کو منع کیا اور اسی طرح دوسری اجناس کے اہم تبادلہ کو بھی اسی احول کے تابع کر دیا۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ مطلومات کے ساتھ ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایسا مطعوم ہو جسے ذخیرہ بھی کیا جا سکے اس لیے وہ چیزیں جن میں طعم ہے لیکن ذخیرہ نہیں کی جا سکتیں تو ان میں ربا کا اجراء نہ ہوگا۔

بہر حال دور جدید کے کرنسی نظام اور مارکیٹ کے نظام کو دیکھتے ہوئے اب دور جدید کے فقہاء کو چاہیے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں جدید اصول وضع کریں، اس لیے کہ جدید دور میں کرنسی کا معیار بدل گیا ہے، محض سونا و چاندی معیار نہیں رہے اور پھر دور جدید میں تمام اشیاء یا اکثر اشیاء کا وزن کیا جاتا ہے اور کرنسیوں کے بھی مختلف معیار ہیں۔ لہٰذا ربا کے تعین میں درج ذیل امور کو مد نظر رکھا جائے۔

۱۔ روپیہ اور کرنسی اور اشیاء کا معیار قیمت۔

۲۔ قرض کی جدید شکلیں،

۳۔ قرض پر منافع۔

جیسا کہ کہا گیا امام شافعی سونے چاندی میں ربا کا اجراء اس لیے قرار دیتے ہیں کہ وہ سکہ ہیں اور معیار تبادلہ ہیں اور امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ ان میں اجراء اس لیے ہوا ہے کہ یہ وزنی ہیں۔ جدید کرنسی کے نظام میں ان دونوں فیکٹر کی کیا اہمیت، دور جدید کے فقہاء کو چاہیے کہ وہ اس کا جائزہ لیں اور ربا کی حقیقی علت دریافت کریں، بہر حال جہاں تک ربا الفضل کا تعلق ہے اس کی صورتیں اب محدود رہ گئی ہیں۔

فقہاء نے جو کاوشیں کی ہیں ان کی روشنی میں جدید نظام کی تشکیل ضروری ہے، فقہاء احناف نے جو اصول وضع کیے ہیں ان کے مطابق ربا کی علت جنس اور قدر ہے، قدر سے مراد ان کی یہ ہے کہ وزن اور ناپ سے کسی چیز کی مقدار کا تعین۔

(ا)۔ اگر متبادلین میں جنس اور قدر دونوں موجود ہوں، مثلاً

ا۔ (جنس + قدر) تو چار صورتیں ہوں گی۔

(حاشیہ)

فان وجد نا (القدر والجنس) حرم الفضل والنساء وان علما حلا (الفضل والنساء وان وجد احدھما (ای القدر وحدہ او الجنس وحدہ) حل الفضؒ و حرم النساء (شامی ج۵۔ ص ۱۷۲، طبع دار الفکر ۱۹۷۹ء)

ا۔ صاع بعوض صاع گندم دست بدست (جائز)

۲۔ صاع بعوض صاعین دست بدست (سود)

۳۔ صاع بعوض صاع مستقبلا (سود)

۴۔ صاع بعوض صاعین مستقبلا (سود)

۲۔ نہ جنس ہو اور نہ قدر ہو۔ (جنس۔ قدر)

ا۔ ایک روپے ایک صاع گندم دست بدست (جائز)

۲۔ ایک روپے دو صاع گندم مستقبلا (جائز)

۳۔ قدر ہو اور جنس نہ ہو (قدر۔ جنس)

ا۔ ایک صاع گندم بمقابلہ ایک صاع جو دست بدست (جائز)

۲۔ ایک پیمانہ گندم بمقابلہ دو پیمانہ جو دست بدست (جائز)

۳۔ ایک پیمانہ گندم بمقابلہ ایک پیمانہ جو مستقبلا (سود)

۴۔ جہاں قدر نہ ہو اور جنس موجود ہو (قدر۔ جنس)

ا۔ ایک غلام ایک غلام کے بدلے دست بدست (جائز)

۲۔ ایک غلام دو غلاموں کے بدلے دست بدست (جائز)

۳۔ ایک غلام ایک غلام کے بدلے استقبالا (سود)

“An excess, accordingly to legal standard of measurement of capacity, or weight in one of the two homogeneous articles opposed to each other in a contract

of exchange and in which such excess is stipulated as obligatory condition on one of the parties, without any return"

یہ تعریف ربا الفضل اور ربا النساء دونوں پر صادق ہے لیکن دور جدید کے تجارتی نظام میں ربا الفضل کی صورتیں سرے سے موجود ہی نہیں۔ تمام تجارت کرنسی اور ثمن کے ساتھ ہوتی ہے، براہ راست اجناس کا

تبادلہ نہیں ہوتا اس لیے۔

"ایسا معاوضہ جس میں مدت کے عوض یا بلا عوض کوئی اضافی جنس یا قدر وصول کرنا طے کیا گیا ہو"

ربا ہے۔ صاحب تنویر الابصار اسے یوں بیان کرتے ہیں۔ "فضل مال عن عوض بمیعاد شرعی مشروط لاحد المتعاقدین"۔

علامہ ابو اللیث سمرقندی نے ربا الفضل کی تعریف یوں کی ہے:

هو فضل عين مال على الميعاد الشرعى وهو الكيل والوزن عند اتحاد الجنس" **(تحفۃ الفقہاء ۲۸/۲، دار الفکر، بیروت)**

اور ربا النساء کے بارے میں کہتے ہیں:

فضل الحلول على الاجل وفضل العين على الدين فى المكيلين و الموزونين عند اختلاف الجنس اوفى غير المكيلين والموزونين عند اتحاد الجنس۔ (تحفۃ الفقہاء ۲۸/۲)

ایک اور ساتھی مصنف یہ تعریف کرتے ہیں:

عقد على عوض مخصوص غير معلوم التماثل فى ميعاد الشرع حالت العقد او مع تاخير فى البدلين او احداهما۔(الاقناع فى حل الفاظ ابى شجاع، ص ۲۲۴، (شافعى)

SiddiquiDr. Nejat Ullah
Islamic Economics Centre, Saudi Arabia

The Ouran has used the word riba in its literal meaning of 'increase'', as in Sura 30,Verse 39 which reads :

"That which you give in usury in order that it may increase on (other)peoples' property hath no - increase with Allah; but that which ye give incharity, seeking Allah's countenance, hath increase manifold ".

Scholars are agreed that the prohibited 'increase' refers to the increaseon the principal in a loan transaction, i.e. what we now call interest. This meaning is confirmed-by Ouran in Sura 2, Verses 278-279 which read :

"On ye who believe! Observe your duty to Allah and give up what remaineth (due to you), from usury, if ye are (in truth) believers? And if ye do not, then be warned of war (against you) from Allah and his messenger. And if ye repent then ye have your principal (without interest). Wrong not and ye shall not be wronged[1] ".

The riba prohibited by Ouran does cover, therefore, the simple and compound interest existing in thepresent-dayfinancial transactions .

The Sunnah, too, confirms this definition of rib a, i.e. any increase on theprincipalstipulated in a loan transaction. The Prophetin his last Haj sermon, isreported to have said: "Beware, all riba outstanding -from the' riba prevalent during the pre -Islamic period is void. You are entitled to your principal sum- -. .neithershallyouoppress nor shall you be oppressed against ".

(Abu Dawood, Sunan, Tradition No. 3334, Kitah al Buyu' Bab-fi-wad'alriba. Also see Tirmidhi, Sunan, Tradition No. 3087, Kitab TafsiralQuran, Bab Sura Tawba.) The Sunnahhas also prohibited riba involved in barter and exchange of currencywith which often served as a cover to what was in reality riba in loan transaction .The relevant traditions are well-known but they do not concern us here as theyonly broaden the scope of the definition of riba without diluting in any sense thecrux of the definition given above .
Riba as defined in the Quran and Sunnah does, therefore, cover simpleand compound interest in the present-day financial transaction .

Mr. S.M. Hasanuz Zaman
Research Department, State Bank, Karachi.

The inferred meaning (isharat al-nass) of the Quranic verse “And if ye repent then ye have your principal (2:279) is suggestive of the Quranic definition of interest. This implies that anything chargeable in addition to principal amount comes in purview of prohibited riba which is the Arabic word for interest.

The Holy Prophet was more concerned with plugging the loopholes towards charging interest and eliminating inequities appearing in barter transaction. Thus

[1]Translation taken from M.M. Pickrhal: The Glorious Quran,

whatever he disallowed as interest explained the scope of application of Quranic interest rather than suggesting any new definition. The well-known narration:-

‘كل قرض جر منفعۃ فھو ربا ‘

Al-Suyuti Al-Jami al-Saghir Cairo Vol. 2, p. 94) made by Hasan Basri on the authority of Hadrat Ali and understood by some commentators as Hadith has generally been treated to be the standard definition of interest that provides us with a touchstone of determining the nature of a transactions of debt or credit. The definition as inferred from the Quranic verse and the direct definition as given in the reported Hadith cover simple increase on loan. The Quranic ban on simple interest followed a ban on exorbitant or compound interest in the verse:-

لا تاكلوا الربا اضعافا مضاعفۃ (3:130).

This policy is inspired by the mode of prohibition in the Quran that warns:-

فاذ نوا بحرب من الله ورسولہ

(2:279)

The question if the ban on interest as imposed by the Quran and detailed out in the Hadith would be equally applicable in the present-day financial transactions would be decided on the basis of the well-known fiqhi rule which provides that:-

“العبرۃ لعموم الحكم لا لخصوص السبب”

Thus the absolute prohibition as pointed out above would not be relaxed unless it is done so in the Quran or by the Holy Prophet(PBUH) himself or on the ground of a convincing argument because the rule is that:

المطلق يجرى على اطلاقہ ما لم يكن دليل التقليد نصا او دلالتہ(Majalla Art. 64)

Dr. M. Ramzan Akhtar

Asstt:Prof. International Institute

of Islamic Economic, Islamabad.

The word, Riba, as understood from the Holy Qur'an and Sunnah, is any extra payment received over and above the principal amount, regardless of fact that extra amount is significant or insignificant. Islam, therefore, considers the Riba, Haram, in all of its forms.

Fuqaha have given two interpretations of the word, Riba: Riba-al-Nasia (رباالنسیئہ) and Riba al-Fadl (رباالفضل)

Riba al-Nasia is defined as,

هو القرض المشروط فیہ الاجل و زیادة مال علی المستقرض

which is translated as :

> "Any lending arrangement that obligates the borrower to pay a certain extra amounting over and above the payment of the principal amount against the specified deferment."[2]

Similarly, Imam Baihaqi reports the interpretation of Riba by Hazarat Fuzalah Ibni Ubaid (Radi Allah Anho) (کل قرض جر منفعۃ فھو وجہ من وجوہ الربا) which is translated as: "Any lending arrangement which results in some benefits to the lender is one of the kinds of Riba".[3]- It is important to note that the Ayahs of Holy Our'an prohibiting the interest relate to Riba al-Nasia,

> "O' Ye who believe, fear Allah and give up what remains of your demand for usury, if Ye are indeed believers." (Al-Baqara, 278)

> "If Ye do it not, take notice of war from Allah and his Apostle, but Ye turn back, Ye shall have your capital sum: Deal not unjustly, and Ye shall not be dealt with unjustly," (Al-Baqarah, 279).

At the time of revelation of the above Ayahs, the prevalent form of Riba was Riba al-Nasia. Therefore, the companions of the Holy Prophet (PBUH) understood the meaning of these Ayahs in terms of Riba al-Nasia. Thus Riba al- Nasia was categorically regarded Haram in matters of Qarz (قرض).

Raba al-Fadl occurs in those commodity exchange contract where a contract provides payment of any extra quantity of the commodity.

For instance, one kilogram of wheat is exchanged for more than one kilogram of wheat, regardless of quality consideration. What matters is, that a given quantity is to be exchanged for the same quantity. In this case the Hadith of the Prophet (PBUH).

---

[2]Razi. Imam Abu Bakar Jassas, "Ahkarn-ul-Our'an", Vol. 1, p. 557.

[3]Baihaqi, Imam, "Sunan-e-Kubra", VoL 5; p. 350.

"الذهب بالذهب مثلا بمثل والفضة بالفضه مثلا بمثل والتمر بالتمر مثلا بمثل والبر بالبر مثلا بمثل والملح بالملح مثلا بمثل الشعير بالشعير مثلا بمثل فمن زاد او ازداد فقد اربى، بيعوا الذهب بالفضه كيف شئتم يدا بيد و بيعوا الشعير بالتمر كيف شئتم يدا بيد۔"

The Hadith is translated as:

"Sell gold by gold, silver by silver, dates by dates, wheat by wheat, salt by salt, and barley by barley, like for like and equal for equal. So he who made an addition or who accepted an addition, committed the sin of taking interest. But sell gold for silver as you like but hand to hand and sell barley for dates as you like but hand to hand."

Though the above Hadith mentions the incidence of Riba in six things but the Fuqaha have extended the application of this Hadith to all commodity transactions characterized by the same underlying reason (i.e. علت). Whenever the same commodity is exchanged for more (quantity), the Riba al-Fadl will be incurred.

In the light of above explanation, it is clear that the word, 'Interest' ascommonly understood in context of-banking/financial pertains to the Riba al-Nasia. Therefore, any extra payment specified in Oarz (قرض) relating contract over and above the principal amount, falls under the definition of Riba al-Nasia, irrespective of the rate/amount of the extra payment. Hence, both the simple and the compound interests are prohibited as being Riba al- Nasia.

Some People, perhaps have misunderstood the meaning of the verse:-

"O Ye who believe, devour not usury doubled and multiplied but fear Allah that ye may (really) prosper" (3:130)."

and have tried to argue the admissibility of the Simple interest. This is totally wrong derivation.

As a matter of fact, the Holy Our'an wants to root out interest-ridden mentality transpires from the Verse (2:279). Ibn-e-Jareer has reported the interpretation of Hazrat Oatada (Radi Allaho Anhu) in his book:

ما كان لهم من دين فجعل لهم ان ياخزوا رؤوس اموالهم ولا يزدادوا عليه شيئا۔

which is translated as: "That the Holy Our'an permits the lender to receive the principal amount only and does not allow any addition (however small it may be)." (Ibn Jareer: Jami al Bayan Vol. 3, p. 67)

Prof Dr. Ala'uddin Kharofa: School of Laws, Malaysia.

USURY IN ARAB SOCIETY PRIOR TO ISLAM

Arab people were dealing with usury. It was customary for one to borrow from another with usury. If the lender did not get back his loan with the usury on time, he would increase the amount of the debt and the usury. The Arab nation, prior to Islam, as well as after Islam, consisted of business people. They traded with the North Arabian Peninsula and with South "Yemen", and with Ethiopia, "Africa" and with countries around the Mediterranean Sea. One of the ports through which the Arabs travelled was Eden, which was the centre of business with India. The Arabs had two trips: one in Winter to Yemen, and another in Summer to Damascus. The Holy Ouran has mentioned these two trips.

THE ATTITUDE OF ISLAM ON USURY

Naturally, when Islam was revealed from Allah(s) to direct humanity to the best way of life among its teachings was the prohibition and cancellation of usury.

We read In the Holy book, the Koran, the following:

"وماتيتم من ربا ليربوا فى اموال الناس فلا يربوا عندالله وما اتيتم من زكوة تريدون وجہ الله فاولئک ہم المضعفون۔"

(That which ye give in usury in order that it may increase on other people's property hath no increase with Allah; but that which ye give in charity, seeking Allah's countenance, hath increase manifold). (Chapter Al Rum 30:39)

"فبظلم من الذين هادوا حرمنا عليهم طيبات احلت لهم و بصدهم عن سبيل الله كثيرا۔ واخذهم الربوا و قد نهوا عنہ واكلهم اموال الناس بالباطل واعتدنا للكافرين منہم عذابا اليما۔"

(Because of the wrongdoing of the Jews we forbade them good things which were (before) made lawful unto them, and because of their much hindering from Allah's way. And of their taking usury when they were forbidden it, and of their devouring people's wealth by false pretences. We have prepared for those of them who disbelieve a painful doom).

(Al-Nisa 4:160-161)

يا ايہا الذين آمنوا لا تاكلوا الربوا اضعافا مضاعف و اتقوا الله لعلكم تفلحون۔ واتقوا النار التى اعدت للكافرين۔ واطيعوا الله والرسول لعلكم ترحمون۔

(O Ye who believe! Devour not usury, doubling and quadrupling (the sum lent). Observe your duty to Allah, that ye may be successful. And ward off (from yourselves) the Fire prepared for disbelievers).

(AI-Emran 3:130-131)

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لا يَقُومُونَ إِلا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا م وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (٢٧٥)يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ (٢٧٦)إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ (٢٧٧)يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (٢٧٨)فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَلا تُظْلَمُونَ (٢٧٩)وان كان زو وعسرة فنظرة الى ميسرة وان تصدقوا خير لكم ان كنتم تعلمون۔ واتقوا يوما ترجعون فيہ الى الله ثم توفى كل نفس ما كسبت وهم لا يظلمون"

The translation of these verses is:

> "Those who devour usury cannot rise up save as he rises one whom the devil has by his touch driven to insanity. That is because they say: Trade is just like usury; whereas Allah permitteth trading and forbiddeth usury. He unto whom an admonition from his Lord cometh, and (he) refraineth (in obedience thereto), he shall keep (the profits of) that which is past, and his affair (henceforth) is with Allah. As for him who returneth (to usury) -- Such are rightful owners of the Fire. They will abide therein."

Allah hath blighted usury and made alms giving fruitful. Allah loveth not the impious and guilty.

Lo! those who believe and do good works and establish worship and pay the poor-due, their reward is with their Lord and there shall no fear come upon them neither shall they grieve.

O Ye who believe! Observe your duty to Allah, and give up what remaineth (due to you) from usury, if ye are (in truth) believers.

And if ye do not, then be warned of war (against you) from Allah and His messenger. And if ye repent, then ye have your principal (without interest). Wrong not, and ye shall not be wronged.

And if the debtor is in straitened circumstances, then (let there be) postponement to (the time of); and that ye remit the debt as alms giving would be better for you if ye did but know.

And guard yourselves against a day in which ye will be brought back to Allah. Then every soul will be paid in' full that which it hath earned, and they will not be wronged. (AI-Baqarah: 275-281)

Prophet Mohammad (PBUH) was the first to implement all the teachings of Allah(s): therefore, he has forbidden his followers to deal with others by usury. Abdullah bin Masood narrated that, Prophet Mohammad (PBUH) cursed the one who takes usury, the one who pays it, the one who will be witness on it, and the one who writes its contract. In another narration the Prophet (PBUH) said, about those who have been mentioned here, that they are equal in the sin.

Then, in the farewell sermon "Khutba" the Prophet (PBUH) said "And all the usury is under my feet. The first usury cancelled, “forbiden" is the usury of my 'uncle, Al-Abbas son of Abdul-Muttalib". There are other Hadiths which are warning the Muslims of dealing with other by usury.

So, it was established in Islam that usury is forbidden, "Haram", by the Holy Quran and by the Holy Prophet (PBUH), and that was the opinion of all the Muslim scholars.

And here we see the prestige of Islam and its uniqueness. When Islam forbade usury, it did not forbid it between a Muslim and another Muslim only, but also between Muslim and non- Muslim alike....

Abu Hanifa . (May Allah be pleased with him) said that if a Muslim enters the place of war, "Dar AI- Harb", it is legitimate for him to deal with the people by usury. His evidence is that the body of the enemy, "Al-Harby", is legitimate, therefore, his money is legitimate too. But, according to Imam Malik (may Allah(s) be pleased with him) -even in this case, the case of a Muslim entering the place of the enemy, Dar Alharb, usury is forbidden.

In contrast we should remember here that the Jewish scholars have permitted the Jew to take usury from the Gentile "other than a Jew"!!!

Muslim jurists (may Allah bless them) have explained as usual, the cases of usury in detail: They said that it is: "A surplus on a debt you pay". In other words, if someone borrowed one hundred dollars, he should not pay back more than the same he has borrowed, i.e. one hundred dollars. If he pays one dollar more, this one dollar is considered usury.

Some scholars have defined usury as-conditional surplus on a debt. Other scholars have defined usury at the time of the ignorance, "AI-Jahilya", as follows:

The usury at the time of the ignorance provided that if one sold anything to another for a fixed time, and; if the term was over and the buyer could not pay, he could get an extension of time with an increase in the price (surplus) (AI- Askalani: Fath AI-Bari,

Sharh Sahih Al-Bukhari V. 4, p. 17).

According to other scholars, usury at the time of the ignorance provided that a man had the "right" to a fixed time; that when the time came, the lender would say: "Are you ready to pay?" or, "Do you want an extension with usury?" If the debtor paid the debt, the transaction was over. But, if the debtor was unable to pay, the lender would increase the amount of the debt and grant an extension of time, and postpone the debt with surplus on the original amount.

It should be noted that not every "surplus" in transaction is forbidden in Islam. The surplus which is a result of buying and selling is legitimate and lawful. The "surplus" which is forbidden and prohibited is "surplus" called "usury".

The significance of prohibition of usury in Islam was protection for the underprivileged, the poor, and the needy; and also protection for the rich from the resentment and the jealousy of the poor, which could lead to social unrest and revolution.

The ban on usury was only one of many blessings brought to mankind by Islam. By banning usury, Islam eradicated one of the basic causes of conflict in humanity. The Islam aims at to build a society based on peace, harmony, cooperation and collaboration, and not on competition and economic welfare among individuals, groups, and nations.

It is difficult to go into detais in this paper, on the subject of usury. However, I would like to mention here that usury is equal to or synonymous with the interest. There is no difference between the two words, "usury" and "interest". From the Islamic point of view whatever is being paid over and above the debt, conditionally, is "Riba" usury, or interest.

The prohibition of usury is one of the pillars of the Islamic economy. This prohibition cannot be isolated, nor can it be considered a blame against Islam. We, the Muslims, should believe that everything comes from Allah(SWT). The command of the Creator should be followed and implemented in the society. The teachings of Islam ought to be followed.

I have been reading, writing and lecturing about usury for thirty-eight years, and I have concluded that interest is usury. And if some scholars say the opposite, they are wrong.

On the other hand, no one can say that the elimination of usury can be done in the society, in the Twentieth Century easily or at once. But, we should believe that all the teachings of Allah(s) are among the possibilities and the practicalities.

When Islam eliminates usury, it has brought an alternative, which is interest-free loan, (القرض الحسن) which means, as I would like to translate it as: The Blessed Loan.[4] We read in Chapter 2:275 (which we brought it in beginning of this research that Allah(s) has ordered the lender to be patient with the borrower if, the latter was unable to pay his debt. According to the Holy Koran, the lender has no right to charge usury, but he has to wait. Some people think that if usury would be eliminated completely, the whole society would be paralyzed or even may freez and none would be able to do any business. This idea is wrong. There are countless ways to earn money with in the bounds of Islam. Among those one is Mudharabah" company, where two parties form a company. The capital(is provided is by one partner and the work is provided by the other partner. They are jointly responsible to share the profit and the loss of the company. The profit must be divided between them according to a fixed share, i.e., one-fourth for one, and three-fourths for other; or one-third for one, and two-thirds for the other; or one-half for each (assuming here that the one who has the capital does not have the time to trade, or docs not have the expertise, etc.). The conditions here are that both parties share in the profit and the loss. If the capital is totally lost, the partner, who was working with his efforts and expertise, is not responsible, since he has also lost his efforts. This kind of trade was very well known in Arab Society during the ignorance time, "Al-Jahiliya". Prophet Mohammad (P) did the same for "Khadijah, daughter of Khouiyled" prior to his prophethood.

This kind of trade is the best alternative to the saving account at the bank, because the bank is responsible for the capital in case of a complete loss. The customer receives a certain percentage as profit, 5%, 7% or more; but he is not responsible for any loss. That is the crucial difference between the saving account and "Al-Mudharaba". The saving account is illegal and forbidden in Islam-- it is "Haram", it cannot be considered as "Al-Mudharabah" company. This is the opinion of the vast majority of the Muslim Scholars (may Allah bless them).

Nawazish AU Zaidi

International Institute of Islamic Economic, Islamabad.

The definition of Riba according to Holy Ouran can be derived from Verses 278-280of Surah Al-Baqarah translation of which is reproduced below:

(278) O ye who believe! Fear Allah, and give up what remains of your demand for Riba if ye are indeed believers.

(279) If ye do it not, take notice of war from Allah and His Messenger: But if ye turn back, ye shall have your capital sums; Deal not unjustly and ye shall not be dealt with unjustly.

---

[4] Some interpreters have translated (قرضا حسنا) as: (beautiful loan) See: Yousif Ali, page 97.
And some others translated these two words (قرضا حسنا) as : (goodly gift) See: The translation of Mohammad Ali, page 105. Also see: The Meaning of the Glorious Ouran, By Mohammad M. Pickthal, page 38.

(280) If the debtor is in a difficulty, grant him time till it is easy for him to repay. But if ye remit it by way of charity, that is best for you if ye only knew.

From the text of above Ouranic Verses the following inference of very basic nature pertaining to Riba can be drawn:--

(1) The believers have been asked to give up the remaining amount of Riba and permitted to receive their Ras-al-Mal. i.e. capital sums (if they repent), gives the Quranic definition of Riba, that is, any addition to the capital sum in a transaction of loan is Riba.

(2) No distinction has been made whether the addition in the capital sum of the loan is based on simple interest or compound interest.

(3) The prohibition of Riba is categorical and without any exception. No distinction has been made whether the loan is contracted for purpose of consumption or production.

(4) No distinction has been made whether the loan transaction is between individuals, corporate bodies or governments.

(5) The message is addressed only to those who are 'believers'.

(6) Those who give up the remaining amount of Riba (and also discontinue future dealings based on Riba) they are believers indeed.

(7) Those who repent and turn back from dealings based on Riba are permitted to receive back their capital sums i.e. Ras-al-Mal.

(8) Continuing any further dealings based on Riba amounts to inviting war from Allah and His Messenger.

(9) It is impossible to call one a believer if one is in a state of war with Allah and His Messenger.

(10) The lender is being asked to reschedule the debt to the time of ease if

the borrower is in difficulty. It implies that the borrower was not in difficulty when the loan was obtained.

(11) In case of the difficulty of the borrower it is being suggested to the lender to remit the loan by way of charity. Had the circumstances of the borrower been bad or difficult at the time of obtaining the loan, the lender should have given the required amount not as loan but by way of charity in accordance with other injunctions of Quran.

The above inferences prove that the prohibition of interest, being an addition to the principal sum in a transaction of loan, is absolute and unconditional. However, as lender has been permitted in Quran to receive back the 'Ras-al-Mal' (principal sum) if he/she turns back from Riba, the principle indexation of a loan may possibly be accepted as permissible. To what extent the use of indexation may be made is a separate issue.

Coming to the inconsequential difference between usury and interest, the 20th Century Chambers Dictionary defines usury as "taking of (now only iniquitous or illegal) interest on loan: interest". It means where there is a legal limit, a rate of interest in excess of that is 'usury'. So, the difference between 'usury'and 'interest' is of a degree and not of kind. As Our'an prescribes a zero rate of interest on loan, any amount in excess of zero is illegal, and from the IsIamic point of view there is no difference between usury and interest. The same dictionary defines interest as "premium paid for use of money". The glossary of terms in Samuelson's Economics defines interest as "the return paid to those who lend money to firms and others", and interest rate has been defined as "the price paid for borrowing money for a period of time". Therefore, there is no difference between the Islamic concept of Riba and the capitalist concept of interest. In fact, *Islam condemns the earning of money through money-lending.*

The definition of Riba (al-Nasia) according to Sunnah of the Holy Prophet (peace be upon him) is given in Hadith Nos. 1, 3, 4, 5 under sub-title of 'Riba al-Nasia' under 'Riba in Hadith' contained in the attached Appendix-Ion Riba in the Qur'an, Hadith and fiqh given in Dr. M. Umer Chapra's book 'Towards a Just Monetary System'. The conclusion is the same i.e. anything in addition to the Ras-al-Mal in a loan transaction is Riba.

Mr. Ziaul H.aq
Chief Research Officer, Pak. Insitute of Development Economist,
Quaid-e •. Azam University, Islamabad.

The society in which the Qur'an was revealed was a tribal society in which barter trade generally prevailed. In barter, just exchange is the crucial problem which means that equivalents are exchanged for equivalents to avoid any exploitation, fraud or cheating. According to the Holy Quran and the Sunnah of the Holy Prophet (peace be upon him) riba, literally an excess or increase, is an unearned income which accrues to any person in an exchange or sale or capital or commodities, or in loans of such commodities. Riba is an unjust exchange between two parties in which no recompense, countervalue or return (badal) is given by one to the other party. This was the general definition of riba formulated by the Muslim jurists. This definition will cover the interest charged by modern banks for loanable funds, illegal usury, all speculative sales of future values, and share-cropping etc. Riba, according to the early Muslim jurists, was a generic and broad term: it is not confined only to the interest charged on the money advanced on loans (riba al-Nasia) it is extensive and pervasive to some sale transactions as well, termed by the Muslim jurists as riba al-fadl, the 'increase' or riba which occurs in sale transactions discussed by the jurists in their books (such as Imam Malik Ibn Anas: Kitab al-Muatta). This definition will cover both the simple and compound interest existing in the present financial system. (Please see for a detailed

treatment of this problem of riba in this respondent's book: *ls1am and Feudalism*. The Economics of Riba; Interest, and Profit. Lahore, Vanguard Books, 1985).

Mr. M. Arshad Javed
Vice-President, Non-Interest Banking Department, Habib Bank, Karachi.

‘Definition of Riba' is the most fundamental question and still remains to be coined in concrete words. The Holy Qur'an categorically prohibits 'Riba' and permits 'Trading'. What is 'Riba' as such, has perhaps not been defined anywhere in the Holy Book. In the Sunnah of the Holy Prophet (PBUH) many examples of as to what is 'Riba' are available in many forms and kinds, mostly found are 'Riba al-Fadl' and 'Riba al-Nasiah'. It is out of these examples that the Muslim Fuqaha, Scholars and' Jurists have tried to draw an inference as to the meaning of 'Riba' and their majority is unanimous that 'Riba' in all its forms, types and kinds is 'Haram'. So far as 'Riba' as applicable to lending financial transactions is concerned they say that:

'Any increment in money capital in respect of nothing but TIME is Riba.'

Accordingly the Interest (whether simple or compound) as existing in the present -day financial transactions is 'Riba'.

In my humble view lot of research work is still required to be done. Many questions yet remain to be answered and many aspects still need to be examined and evaluated both in the historic as well as in the present -day context.

(a) Were there any financial transactions of present-day nature existing during the days of the Prophet (PBUH)?
(b) Were business loans in practice at that time? If so, what was the actual mechanism?
(c) Do the present day business loans possess the exploitative character as was there in those days existing in personal/consumption loans?
(d) What was the nature 'of money at that time? Did its value increase or decrease with relation to time?
(e) Is there any evidence available as to the maximum period of loan in those-days? Did, inflation erode the value of money or it’s purchasing power-in-the short-run or long-run as it does today?
(f) Is any incidence of devaluation or revaluation of currency found in those days? etc. etc. '

Mr. Imtiaz Pervez

General Manager, Faisal Islamic Bank of Bahrain.

The prohibition and elimination of interest is the core of Islamic financial system, God's immense disapproval of interest is evident from some of the verses from the Holy Quran (2:278-279). According to Dr. Mahmoud Abu Saud, money, under Islamic laws, is considered as a means of exchangev. It cannot be equated with commodity for the reasons that (a) money has a technical (or artificial) property of yielding its owner' real income simply by holding it, i.e. without exchanging it against other goods (b) it is liquid and has no carrying cost, no production cost (almost so) and no-substitute, (c) demand on money is not genuine as it is derived from demand for goods that money. ???

REPORT OF BANKING DELEGATION SUBMIITED BY

MR. MANSOOR AHMAD KHAN, SENIOR ADVOCATE,

SUPREME COURT OF PAKISTAN

Ulema, over the centuries are unanimous in their views and there is hardly any worth noticing dissent on the subject that time-related fixed monetary returns on a loan, howsoever, conceived or planned, fall to be considered 'riba' attracting prohibition under specific injunction of the Holy Quran.

Question No.2. If banking is based on interest-free transactions, what-would-be its basic practical shape in conformity with the Injunctions of Islam?

سوال نمبر2۔: غیر سودی بینک کے قیام کی صورت میں بینکوں کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کی عملی صورت کیا ہو گی؟

مولانا گوہر رحمان صاحب۔

(الف)۔ پہلا قدم تو یہ اٹھانا ہو گا کہ ملک کی تمام معاشی سر گرمیوں سے سود کو قانوناً ختم کر دیا جائے۔ سود کے دروازے چوپٹ کھلے رکھ کر غیر سودی بینک کاری کی عملی صورتیں تلاش کرنا نہ عقل و خرد کا تقاضا ہے اور نہ شریعت کا تقاضا ہے۔ جب تک سود خواروں کو ملکی قانون اور عدالتوں کی مدد حاصل ہے اس وقت تک غیر سودی نظام مالیات وجود میں نہیں آ سکتا۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ فاضل عدالت حکم صادر فرمادے کہ سود اسلام میں حرام ہے اور تمام وہ قوانین (ناموں کے تعین کے ساتھ) اور قواعد و ضوابط اسلامی احکام کے خلاف ہیں جن کی بنیاد پر ملک میں سودی لین دین ہوتا ہے۔ حکومت کو ایک متعین مدت دے دی جائے کہ اس کے بعد یہ سارے قوانین کالعدم ہو جائیں گے اور عدالتیں تمام مالی امور کے فیصلہ شرعی احکام کے مطابق دینے کی قانوناً بھی مجاز ہوں گی۔ یہ مدت طویل نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ حکومت کو پہلے ہی ۴۴ سال کی مدت مل چکی ہے اور عملی خاکے تیار ہو چکے ہیں۔

(ب) غیر سودی بینک کاری کے اجراء اور بینکوں کے نظام کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کا مثالی اور بہترین طریقہ تو شرکت اور مضاربت کا نظام ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس سلسلے میں بڑا مفید کام کیا ہے۔ اس نے سودی نظام کے خاتمے کے لیے اپنی حتمی رپورٹ جون ۱۹۸۰ء میں صدر مملکت کی خدمت میں پیش بھی کر دی تھی مگر افسوس ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ پی ایل ایس کا جو سسٹم بینکوں میں چل رہا ہے اس میں بھی سود شامل ہے اور یہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کے مطابق نہیں ہے۔ شرکت و مضاربت کے تفصیلی احکام جو ہر دور میں قابل عمل ہیں حدیث و فقہ کی کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس موضوع پر بھی اپنی معروضات اور خدمات پیش کر سکتا ہوں۔ انشاء اللہ مگر اس سلسلے میں پہلے ہی مسلم ماہرین معاشیات کافی کام کر چکے ہیں۔

(ج) عقد بیع میں ادھار کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ربوا نہیں ہے اور جائز ہے بشرطیکہ قیمت کا تعین معاہدہ بیع کے وقت وضاحت کے ساتھ کر دیا گیا ہو اور میعاد میں اضافے کے ساتھ قیمت میں مزید اضافہ نہ کیا جائے یعنی مارک اپ پھر مارک اپ کا سسٹم نہ ہو اگر مشتری میعاد پر قیمت ادا نہ کر سکے تو پھر بھی قیمت وہی ہو جو عقد بیع کے وقت طے کی گئی تھی۔ نقد کے مقابلے میں ادھار قیمت میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ قرض میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جو ربوا نہیں ہے بلکہ ثمن ہے اور جائز ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے بیع موجل کا جو جائز طریقہ تجویز کیا تھا حکومت نے اس پر عمل نہیں کیا اور غیر سودی کاروبار کے نام سے سود ہی کی لعنت کو برقرار رکھا ہے۔ اس موضوع پر میری ایک تحریر پہلے سے تیار تھی۔ اس کی فوٹو کاپی ارسال خدمت ہے۔

(د) ایک معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی رقوم حفاظت کے لیے بطور امانت بنکوں میں رکھتے ہیں اور ان رقوم کو بنک امانت کی بجائے قرض کے طور پر اپنے پاس رکھے اور مقررہ میعاد پر یا عند الطلب واپس کرنے کی ضمانت دے ایسی صورت میں بنک کو حق حاصل ہو گا کہ ان رقوم کو تجارت میں لگائے اور نفع کمائے اور اگر نقصان ہو جائے تو اسے اپنے دوسرے ذرائع سے پورا کرے چونکہ یہ رقم لوگوں کے قرضے ہوں گے اور قرضوں پر نفع لینا جائز نہیں ہے اس لیے نفع میں کھاتہ داروں کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ اور ان کا مقصد بھی نفع کمانا نہیں ہو گا بلکہ اپنی بچتوں کی حفاظت ان کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ مشہور صحابی زبیر بن عوام جو بدری ہیں اور عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں ان کی وفات کے وقت ۲۲ لاکھ درہم کا قرضہ ان کے ذمہ واجب الادا تھا اس قرض کی وجہ بیان کرتے ہوئے ان کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر فرماتے ہیں:

انما کان دینہ الذی علیہ ان الرجل یاتی بالمال فیستودعہ ایاہ فیقول الزبیر لا ولکنہ سلف فانی اخشی علیہ الضیعتہ (بخاری ابواب الخُمس باب برکتہ الغازی فی مالہ نمبر (۲۹۶۱)

ان پر جو قرض تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک شخص اپنا مال لے کر آتا اور کہتا کہ اسے اپنے پاس امانت رکھ لو مگر حضرت زبیر فرماتے نہیں نہیں یہ قرض ہو گا کیونکہ مجھے اس کے ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔

ابن حجر عسقلانی نے اس کی دو وجوہات بیان کی ہیں ایک یہ کہ قرض بنا کر اس مال کا تحفظ کیا جائے اور مالک کو اطمینان حاصل ہو جائے اس لیے کہ قرض بہر صورت واجب الادا ہوتا ہے اور امانت کے ضائع ہو جانے پر اس کا عوض واجب نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ حفاظت میں غفلت نہ برتی گئی ہو۔ اور دوسری وجہ ابن بطال کے حوالے سے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس مال سے تجارت کرنا اور نفع کمانا حضرت زبیر کے لیے جائز ہو جائے (فتح الباری طبع مصر ۱۹۵۹ء ص ۳۸، ج ۷، ابواب الخمس)

قرض کھاتے میں بڑی مقدار میں رقوم بنکوں کو مل سکتی ہیں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں کہ جدید بنکوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ عند الطب کھاتوں میں (جن پر سود نہیں دیا جاتا) جمع کی جانے والی رقوم بحیثیت مجموعی ان طویل المدت رقوم سے زیادہ ہوتی ہیں جو بچت کھاتے میں جمع ہوتی ہیں۔

(غیر سودی بنکاری ص ۵۹، ۶۰، بحوالہ ریڈ کلف کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۵۹ء) اسی صفحے کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۵۸ء میں برطانیہ کے تجارتی بنکوں کے مجموعی کھاتوں کا ۶۰ فیصد حصہ عند الطلب کھاتوں پر مشتمل تھا اور ۴۰ فیصد طویل المیعاد کھاتوں پر۔ امریکہ میں بھی دونوں کھاتوں کے درمیان یہی تناسب ہے۔

قرض کے کھاتے سے حاصل شدہ تجارتی نفع کا ایک حصہ ریزرو رکھا جا سکتا ہے جس سے عند الطلب قرضوں کی ادائیگی بھی ہو سکے گی اور ان کھاتوں پر بنک کے آنے والے اخراجات بھی پورے ہو سکتے ہیں بلکہ اس نظام سے عوام اور حکومت کو غیر سودی قرضے بھی دیے جا سکیں گے۔

(ھ) غیر سودی بنک اسی طرح جائز خدمات پر معاوضہ وصول کر سکیں گے جس طرح آج بھی بالمعاوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں اس مد سے بھی بنک کو کافی آمدنی ہو گی حقیقت یہ ہے کہ جب سود کے راستے کلی طور پر بند کر دیے جائیں گے تو غیر سودی راستے خود بخود سامنے آتے رہیں گے مگر شرط یہ ہے کہ عزم بھی ہو اور اخلاص بھی ہو۔ حکومت کی جانب سے جاری کردہ قرضوں پر سود کا مسئلہ۔

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

ان سوالات میں سود کے خاتمے کے بعد اس کی متبادل صورتیں طلب کی گئی ہیں، یہاں ان کا مفصل جواب لکھنے میں تاخیر کا اندیشہ ہے، اس لیے ان سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ سود کی متبادل صورتیں، اسلامی نظریاتی کونسل کی تفصیلی رپورٹ میں مرتب شکل میں موجود ہیں جو اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور سود کے متبادل کے طور پر ان صورتوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

نیز ۱۹۸۸ء کے اواخر میں وفاقی حکومت نے جو "مستقل اسلامی اقتصادی کمیشن" قائم کیا تھا، اس کے ایک رکن گورنر اسٹیٹ بنک تھے۔ ناچیز بھی اس کا ایک رکن تھا اس کمیشن کے ورکنگ گروپ میں بھی ناچیز شامل تھا، اس ورکنگ گروپ نے بھی سود کی متبادل صورتیں بینک کاروں، ماہرین معاشیات اور محقق علماء کرام کے مشورے سے ایک عبوری رپورٹ کی شکل میں مرتب کی تھیں، جنہیں باآسانی فی الفور نافذ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

غیر سودی بینک کے قیام کی صورت میں اسلامی بینک کاری کو شرکت اور مضاربت کے سہارے قائم اور پروان چڑھایا جا سکتا ہے، اس کی مختصر تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ ابتداء میں جو لوگ بینک قائم کریں گے وہ حصہ دار (Shareholders) ہوں گے، پھر اس بینک میں عوام کی طرف سے جمع شدہ امانتیں دو قسموں میں تقسیم ہوں گی۔ ایک عند الطلب قرضے (Current account) اور دوسرے مد مضاربت (Fixed deposit) اس کے تحت سیونگ اکاؤنٹ عند الطلب قرضوں میں شمار ہو گا۔

عند الطلب قرضوں کے تحت تمام رقوم بینک کے پاس بطور قرض محفوظ ہوں گی۔ کھاتہ دار ہر وقت بذریعہ چیک ان کی واپسی کا مطالبہ کر سکے گا، اور ان پر کوئی منافع کھاتہ دار کو نہیں دیا جائے گا، البتہ مضاربت کی صورت میں بینک جو نفع حاصل کرے گا اس میں کھاتہ دار اور بینک متناسب طور (Proportionately) شریک ہوں گے۔

عند الطلب قرضوں اور کھاتہ مضاربت کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقم میں سے ایک حصہ بینک مد محفوظ (Reserve) میں رکھ کر باقی سرمایہ کاروباری افراد کو شرکت یا مضاربت کے اصولوں کے مطابق دے گا۔ کاروباری افراد اس سرمایہ کو صنعت یا تجارت میں لگا کر جو منافع

حاصل کریں گے اس کا ایک طے شدہ متناسب حصہ بینک کو اصل رقم کے ساتھ ادا کریں گے، اور پھر وہ مخصوص حصہ بینک کے ذریعہ کھاتہ داروں میں تقسیم ہوگا۔

جہاں تک کثیر المیعاد قرضوں کے اجراء کا تعلق ہے۔ ان کی مدت بعض اوقات اتنی کم ہوتی ہے کہ شرکت یا مضاربت کے اصول کے تحت ایسے قرضہ جات کا حصول مزید پیچیدگیوں کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ ایسے قرضہ جات بلا سود جاری کیے جائیں۔ البتہ ان کے حساب وکتاب کے اخراجات کی تکمیل اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہر قرض کی درخواست فارم قیمتاً فراہم کی جائے اور اس حاصل شدہ قیمت کو نفع کا متبادل قرار دیا جائے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ بینک کے لیے غیر سودی قرضہ دینے کا محرک کیا ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ غیر سودی نظام بینکاری میں ہر بینک کو اس کی امانتوں کا اکثر حصہ بغیر سودی قرضوں کی صورت میں حاصل ہوگا۔ اس لیے کہ جدید بینکوں کا تجربہ یہ ہے کہ عند الطلب کھاتہ میں جمع کی جانے والی رقمیں بحیثیت مجموعی طویل المیعاد امانتوں (Fixed deposit) کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہیں۔

عموماً اول الذکر رقمیں امانتوں کا ساٹھ فیصد اور موخر الذکر امانتوں کا چالیس فیصد ہوتی ہیں۔ ان ساٹھ فیصد رقوم کا ایک حصہ مد محفوظ میں رکھ کر باقی تمام سرمایہ کو بینک کے منافع بخش کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ طریقہ کار کے علاوہ غیر سودی نظام میں بینک اپنا وہ تمام کاروبار بھی جاری رکھے گا جو وہ اجرت پر سرانجام دیا کرتا ہے۔ مثلاً لاکرز رکھنا، سفری چیک، بینک ڈرافٹ اور لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنا۔ تجارتی اموال کو بلٹی کے ذریعہ منگوانا، بیع وشرا کی دلالی کرنا اور کاروباری مشورہ دینا وغیرہ۔ ان تمام پر وہ اجرت وصول کرسکے گا۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ ۱۰۔ ۱۸۱ بسلسلہ ربوا)

مولانا سید معروف شاہ شیرازی صاحب 28—04—17

اسلام موجودہ بینکنگ نظام کی اجازت نہیں دیتا، موجودہ نظام کو اسلامی اسکیم اور اسلامی تصورات وترجیحات کے مطابق بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں انقلابی ذہن کے ماہرین اور حکومتی سطح پر ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو فی الواقعہ نئے نظام کی تشکیل چاہتے ہوں۔ انقلابی ماہرین اور حکومتی سطح پر تبدیلی کا داعیہ ضروری ہے ورنہ کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ موجودہ بینکنگ کا نظام کوئی ازلی نظام نہیں ہے جب یہ نہ تھا تب بھی دنیا میں بڑی بڑی اقوام اور بڑی بڑی حکومتوں کے معاملات چلتے تھے۔ جو ماہرین انقلابی سوچ نہیں رکھتے وہ موجودہ نظام ہی کو محض نام اور اصطلاحات کی تبدیلی کی حد تک ظاہری تغیر کے ساتھ قائم رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ درحقیقت یہ نظام بذات خود ناکام ہو چکا ہے حکومتیں پندرہ پندرہ سال کے سود معاف کرا رہی اور افراد قرضے واپس نہیں کر رہے اور پوری دنیا کی پالیسی یہ ہے کہ سود کو کم کر کے زیرو تک لایا جائے۔

نیا نظام براہ راست مضاربت پر قائم ہو سکتا ہے یا براہ راست تجارتی اور ترقیاتی اسکیموں کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ ایسے بینک قائم کیے جا سکتے ہیں جو بڑے بڑے ہوٹل بنائیں اور بڑے شہروں کے پاس رہائشی کالونیاں بنا کر اور انہیں کرایہ پر چڑھا کر لامحدود منافع کما سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ قرض یا فنڈ کے ساتھ اگر محنت اور انتظام شامل نہ کیا جائے تو وہ بذات خود نفع پیدا نہیں کر سکتا، موجودہ بینکنگ کا نظام جو قرض فراہم کرتا ہے آخر کار تین چار واسطوں کے بعد ظاہر ہے کہ کسی پیداواری اسکیم میں لگاتا ہے تب ہی سرمایہ پر نفع کا جواز پیدا ہوتا ہے، آخر ایسے مالی ادارے کیوں قائم نہیں ہو سکتے جو براہ راست خود ہی پیداواری اسکیمیں شروع کر دیں مثلاً الف (بینک) ب کو قرض دے۔ ب، ج کو قرض دے ج، د کو قرض دے اور "د" اس سے کوئی کارخانہ چلائے اور نفع کا کوئی حصہ الف تک واپس ہو، آخر الف (بینک) براہ راست کارخانہ کیوں نہیں چلاتا؟ میرے خیال میں درج ذیل تجاویز پر عمل ہو سکتا ہے:

ا۔ بینک بڑے بڑے پل اور بڑی بڑی شاہراہ تعمیر کریں اور اس سے منافع لے کر حصہ داروں میں تقسیم کریں۔

۲۔ بینک رہائشی کالونیاں تعمیر کرائیں اور ان کے کرایہ جات لے کر انتظامی اخراجات وضع کرنے کے بعد حصہ داروں میں تقسیم کریں۔

۳۔ واپڈا، پی آئی اے، ریلوے اور ایسے ہی دوسرے اداروں کو بینک میں تبدیل کر دیا جائے اور ہر ڈویژن میں ایک بینک قائم کیا جائے جس کے ذریعے بجلی کی تقسیم ہو اور موجودہ تمام بینکوں کو یکسر تبدیل کر دیا جائے جو خالص سودی نظریات پر مبنی ہیں۔ اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ان بینکوں کو بزنس کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ جس طرح کہ اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کو ہے۔

۴۔ غرض ایسے تمام ادارے اور کمپنیاں جو منافع کماتی ہیں اور جن کے منافع جات محدود اداروں اور خاندان تک رہتے ہیں۔ انہیں مالیاتی اداروں کی شکل میں ترقی دی جائے۔ تاکہ وہ از خود مضاربہ کی شکل اختیار کر لیں اور اسلامی نظام کا آغاز تجربہ کار ہاتھوں سے ہو۔

۵۔ سورۃ روم آیت ۳۹ میں سود خوار کے مقابلے میں زکوۃ دہندہ کو لایا گیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ سودی نظام کو زکوۃ کے نظام کے ذریعے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جب سودی نظام ختم ہو گا تو زکوۃ کے ذریعے قرض حسن اور الغارمین کی امداد کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ قرض کے لیے حکم ہے فنظرۃ الی میسرۃ۔

لہٰذا زکوۃ فنڈ سے خالص امداد بند کر دی جائے اور مساکین کو قرض دیا جائے اور ان شرائط پر قرض دیا جائے کہ اگر آئندہ زکوۃ سے استفادہ کرنے والا اگر مالدار ہو جائے تو وہ واپس کر دے۔ اسی طرح مفت زکوۃ خوری کی عادت بھی پیدا نہ ہو گی اور زکوۃ سے مستفید ہونے والے یہ احساس بھی رکھیں گے کہ انہیں قرض حسن واپس کرنا ہے۔

۶۔ اس وقت پرائیویٹائزیشن کا جو کام ہو رہا ہے اس پالیسی میں اگر اس قدر تبدیلی کر دی جائے کہ بجلی کی تقسیم، ٹیلیفیون کے ادارے ایسے لوگوں کو دیے جائیں جو غیر سودی بنکاری بھی کر سکتے ہوں یا موجودہ بینک ایسے پرائیویٹ گروپوں کو دیے جائیں جو ساتھ ساتھ ایک کارپوریشن بھی چلائیں، مثلاً ایک بینک اور روڈ کارپوریشن ایک ادارے کو دے دیا جائے دوسرا بینک اور گھی کارپوریشن دوسرے ادارے کو دے دیا جائے۔ حکومت ان اداروں میں اپنے شیئر رکھے اور ان پر نگرانی کرے۔

For banking to be interest-free it is necessary to minimize the role of debt. At present bank deposits are treated as loans to the banks -- they are debts owed to the public by the banks. With the possible exception of current accounts, the nature of bank deposits will have to change from loan to investment. Similarly, the funds advanced by the banks to its clients are presently treated as loans. This too will have to change and assume the nature of investment.

Much of the literature on Islamic economics advocates profit-sharing in its various forms (e.g.mudaraba, musharaka, rent sharing, etc.) as the investment mentioned above. However, the practice of Islamic banking gravitated towards leasing and murabaha

(resale on credit with a mark-up). Islamic Fiqh Academy of the Organization of Islamic Conference (OTC) has given considered opinions on the valid forms of murabaha and leasing. These and profit-sharing in its various forms alongwith some banking functions which can be and actually are performed against a fee or commission (e.g. safe-keeping, consultancy and acting as agents in administering properties trusts, etc.) provide practical shape of banking in conformity with the injunctions of Islam.

Mr. S.M. Hassanuz Zaman

As a concept setting up of banks and financial institutions in an Islamic system is not an objective or an end in itself required to be achieved. The object of prohibition of interest is elimination of injustice in credit system. Thus, banks or no banks, credit should not involve interest. No matter why is it offered and to whom and by whom. The very concept that credit business should be interest-free discourages setting up of financial institution by businessmen. What recommends encouraging these institutions is larger economic interest which can be better achieved through pooling up of savings and organising planned investment. The problem that we are now facing in this respect is that we erroneously deem the profitability of banks as a basic objective and thus rightly find all non-interest techniques as risky and problematic. If this misconcept is removed the problem would ease out. A theoretical approach to solving this problem is contained in Report on Elimination of Interest from the Economy prepared by Council of Islamic Ideology, Pakistan. A number of banks have already been set up in different countries of the world that guide us to different modes of financing without involving in interest. Theory and practice may be combined and further refined to give an ideal practical shape to the institution of interest-free financing.

Dr. Ramzan Akhtar

Practically, the interest-free banking system can be structured on tripartite arrangement, between depositors, banks and borrowers. The nature of arrangement will vary in different cases as summarised below:

A. <u>BANKS AND DEPOSITORS:</u>

Depositors can be of two kinds, Current Account and Saving Account Holders. In the Current Account, the depositors want the bank to protect their savings for a short-time. The bank can accept such deposit (money) on Qarz (قرض) basis. The bank will be bound to repay these funds when demanded by the depositors. In the Saving Account, the people want to invest their saving through banks. The hank can accept such deposits on the basis of Musharkah or Mudarbah. For this purpose, the bank draws up contracts specifying the conditions regarding the mode of investment, distribution of profit/loss of investment etc. Such contracts become enforceable when both parties agree to it.

B. BANKS AND THE BORROWERS/INVESTORS:

Three situations can arise here:

(i) Consumption loans: Bank will extend interest-free loans for genuine consumption purposes.

(ii) Borrowing for Investment: The banks will enter into Mudarbah and Musharkah agreements with the borrowers of the fund for investments with the borrowers of the fund for investment purposes. The agreement will specify the proportions according to which profits/loss will be shared between the investor and the bank. After charging the administrative expenses, the bank will distribute the profits among the share-holders and depositors according to the terms of agreement.

Prof Dr. Ala'eddin Kharofa

The Banks can practice Islamic transactions.

Nawazish Ali Zaidi

Banking is basically a form of 'financial intermediation' in which banks, on one hand, collect or mobilise the savings of the people and on the other hand, make these collected funds available to those, who need these funds for their business or personal needs. Banks operations are generally regulated by a Central Banking Authority.

Under interest-based banking, banks collect the savings of the people by offering them a certain rate of interest. Likewise, the banks also provide funds to users for their business or personal needs on the basis of a higher rate of interest. The difference between the two rates of interest covers the banks' expenses and provides income for the share-holders of the banks. I call this a rigid financial intermediation' which is based on borrowing and lending of funds with an addition in the principal sum which makes interest-based banking unacceptable in a Islamic society.

An alternative model of banking therefore requires to be developed which must fulfil the following conditions;

(a) It must not be based on interest.
(b) It must fulfil the economic role of financial intermediation.
(c) It must finance Halal business and industrial activities.
(d) It must generally promote the economic ideals of Islam.

An Islamic model of banking capable of fulfilling the above roles is possible to develop which can continue to perform the role of financial intermediation in an Islamic way. The banks will mobilise savings and deposits on the basis of profit-sharing and

finance business and industry on a similar basis or any other basis which is Islamically permissible and also has some economic merit. I call this Islamic model a 'participatory financial intermediation' as against the rigid financial intermediation performed by interest-based banks.

For banks or for any other business, the most important thing is as to how their income is earned. This is the generation side or the productive side. The second step thereafter is as to how the income earned is distributed among various factors of production/generation. If the income 'is not earned through Halal sources, any manner of the distribution of that income will-not make it Halal.

So, we have to develop very carefully the financing side or the asset side of banks according to injunctions of Islam. The Holy Quran permits Qarde-Hasan, sale and trade. The Sunnah permits various forms of profit-sharing like Modarabah and Musharaka. In place of an interest-based model of banking, we need to develop a trade-based model of banking. This will surely require a great deal of ground-work. We will have to come up with new applications of the principles of business which arc approved by Islam.

It will be a blend of Modarabah, Musharaka, Ijara, Morabaha and Qarde-Hasan for which the central bank, commercial banks and other financial institutions must be required to have their regular Shariah boards and -Shariah advisors. .

The position in Pakistan has been that the existing 'non-interest systern of banking has come into being without the advice of a Shariah Board or Shariah advisors. Who was supposed to take the necessary measures or neglected its due function/role for not implementing the system correctly resulting in the loss of national effort or time? It must he identified and censured.

The profit-sharing based 'share markets' are successfully functioning everywhere in the world alongside the interest-based 'bonds markets'. This proves that various applications of the concept of profit-sharing can successfully work if efforts are invested in finding solutions which are relevant to our needs.

Mr. M. Arshad Javed

If banking is based on Interest-free transactions, the Banks will have to forego their conventional role of just being a financial intermediary. They will have to assume some other practical shape rather more functional and operational shape. They will either have to enter into profit and loss sharing ventures like Musharika, Modaraba, Equity participation etc. or will have to become Trading Houses themselves and perform the business of purchasing, selling, leasing or hire-purchase etc.

Mr. Ziaul Haq

For interest-free transactions, money and capital resources have to be socialized. If riba is illicit, then those who charge it in financial transactions cannot be prevented unless money and banking resources are socialized. In a capitalist mixed economy like that of present Pakistan, all factors of production are entitled to receive their returns or prices for the services rendered by them.

Mr. Imtiaz Pervez

Islamic financial system allows- for the replacement of interest by a return obtained from investment activities and operations that actually generate extra wealth. Under this system, neither capital nor any income on such capital is guaranteed in advance to the depositor. As such, Islamic bank has no pre-determined cost of funds and is not under pressure to put up an arbitrary price on the cash that it lends. The income generated from the assets underlying the invested funds is passed to investment depositors (Investors) after deducting the Islamic bank's management fee. When higher return is obtained from investment activities, Investors, in terms of their risk sharing relationship with Islamic banks, receive the relevant higher benefits of such investments. In the event of loss, however, the bank loses its fees while the Investors absorb the loss unless such loss was due to gross negligence on the part of the bank proved as such. Islamic banks generally perform the same functions as conventional banks do. They act as financial intermediaries, mainly in a trust function, as well as administrators of the economy's payments and transfer system. While conventional banks exploit market imperfections (surplus, deficits, information, transaction costs, search and acquisition, financial claims etc.) solely to obtain maxim results for the benefit of their shareholders. Islamic bank maintains a greater balance between the interests of Investor, shareholder, user and society. This is because they aim to contribute to socio-economic justice within the framework of its functions of financial intermediation. Due to the very nature of its contractual relationship with Investors, Islamic bank is not exposed to the same vulnerability on the fol1owing counts:

(i) For Islamic bank, Investors' deposits (Investment Funds) being on trust basis, do not count as its own liabilities. Since Islamic bank is liable only in the case of gross negligence in the performance of its trust functions, if proved as such. Investment Funds may count only as its contingent liability. In this sense, Islamic bank is not a highly leveraged institution unless current accounts balances in its books are several times its capital base, which is not normally the case.

(ii) Certain ratios such as Gearing Ratio and Return on Assets (ROA) have no particular relevance to Islamic bank; Gearing Ratio for the reasons that Investment deposits do not form as the Islamic bank's liabilities. Lower ROA of a conventional bank reflects weakness and vulnerability in the case of volatility of

conditions on both sides. Even a slight negative interest-rate mismatch between those guaranteed to depositors and obtained from assets could erode profitability. In the case of Islamic bank, there are no guarantees to Investors and, therefore, no fixed cost of funds. Variation in income from assets remains to be for the account of Investors whose funds are originally employed for acquisition of such assets. This provides for automatic and, in fact, natural adjustment of assets with liabilities without the need for any external intervention.

(iii) Islamic bank as trustee has full discretion on the application Investment Funds under its mutual contractual relationship with Investors. On the other hand, Investors as, more or less equity holders or sleeping partners, have natural commitment in the trustee's decisions and in turn to the underlying assets.

Question No.3.

(i) Does the interest on loans floated by the Government to meet national requirements come under Riba (ربا)?

(ii) What-alternatives can be suggested for the banks in case they grant loans without interest for various requirements?

سوال نمبر ۳

(الف)۔ کیا قومی ضروریات کی تکمیل کے لیے حکومت کی جانب سے جاری کردہ قرضوں پر سود ربا کے ضمن میں آتا ہے؟

(ب)۔ بینکوں کی جانب سے مختلف ضروریات کے لیے غیر سودی قرض فراہم کرنے کے بارے میں آپ کیا متبادل تجاویز دیتے ہیں؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

یقیناربا کے ضمن میں آتا ہے" وحزم الربا و ذروا ما بقی من الربا"اور "کل قرض جر منفعۃ فھو ربا" یہ شرعی نصوص عام ہیں ان میں کسی استثناء کی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ حکومت کا سودی لین دین افراد کے سودی لین دین کے مقابلے میں زیادہ قباحت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ حکومت کا فرض منصبی یہ ہے کہ سود سے معیشت کو پاک کرے اور جب یہ خود اس میں ملوث ہو تو عوام کو کس طرح اس لعنت سے روک سکے گی۔ اس کے علاوہ یہ قانونی نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حکومت دراصل عوام کے وکیل کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ جو کچھ بھی کرتی ہے عوام کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے انہی کے دیے ہوئے اختیارات استعمال کرتی ہے تو جس چیز کی اجازت خود عوام کو حاصل نہ ہو اس کی اجازت حکومت کو کیسے دی جاسکتی ہے؟ جس کام کا حق موکل کو حاصل نہ ہو اس کا حق وکیل کو بھی حاصل نہیں ہوتا، باقی رہیں قومی ضروریات تو ان میں کچھ تو قومی محاصل سے پوری کی جائیں گی کچھ زکوۃ و عشر سے پوری کی جائیں گی، کچھ بینکوں سے غیر سودی قرض لے کر، اس لیے کہ بینک بھی قرض کھاتوں کی رقوم تجارت میں لگا کر نفع کماتے ہیں، لیکن پھر بھی حکومت کو قرضوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے اگر یہ ضرورت پیداواری منصوبوں کے لیے ہو تو حکومت مضاربت اور شرکت کے اصول پر عوام سے اور بینکوں سے سرمایہ حاصل کرسکتی ہے اور ان منصوبوں کے منافع میں سرمایہ فراہم کرنے والوں کو حصہ دار بناسکتی ہے اور اگر غیر پیداواری منصوبوں کے لیے مثلاً دفاع کے لیے یا عوام کو دوسری سہولتیں فراہم کرنے کے لیے قرض کی حقیقی ضرورت درپیش ہو تو وہ جب عوام سے اپیل کرے گی تو امید ہے کہ لوگ رضاکارانہ طور پر غیر سودی قرضے دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جب وہ فاضل دولت حفاظت کے لیے بینکوں کو دیتے ہیں تو قومی ضرورت کے لیے اپنی حکومت کو کیوں نہیں دیں گے۔ حکومت کے پاس تو ان کا روپیہ زیادہ محفوظ ہوگا لیکن اگر بالفرض مذکورہ تمام ذرائع سے مطلوبہ سرمایہ نہ مل سکا اور ضرورت حقیقی فوری ہو تو مطلوبہ قرض سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے زبردستی لینے کا حق بھی حکومت کو حاصل ہوگا اس لیے کہ مصلحت عامہ کو مصلحت خاصہ پر ترجیح حاصل ہے اور امیر کا یہ حکم معصیت کا حکم نہیں ہوگا بلکہ معروف اور نیکی کا حکم ہوگا جس کی اطاعت عوام پر لازم ہے۔

بینکوں سے غیر سودی قرضے حاصل کرنے کی متبادل تجاویز

قومی ضروریات کے لیے حکومت کو جن قرضوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کے بارے میں توشق الف کے جواب میں متبادل تدابیر کا خلاصہ عرض کر دیا گیا ہے۔ باقی رہے وہ قرضے جو عوام کو اپنی صرفی یا تجارتی ضروریات کے لیے فراہم کیے جاتے ہیں تو اس بارے میں درج ذیل نکات پیش خدمت ہیں :

۱۔ غیر سودی معاشرے میں انشاء اللہ باہمی تعاون اور ہمدردی کا ایسا ماحول پیدا ہو جائے گا جس میں لوگ ایک دوسرے کی مدد قرض اور اعانت دونوں صورتوں میں کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور بینکوں یا حکومت سے قرض لینے کی ضرورت نسبتاً کم ہو جائے گی۔

۲۔ جو لوگ اپنی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو چکے ہوں اور قرض کی واپسی کا کوئی ذریعہ بھی نہ رکھتے ہوں تو ان کی کفالت حکومت اور معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ زکوۃ و عشر سے یا قومی خزانے سے ایسے لوگوں کو قرض نہیں بلکہ امداد دی جائے گی اور حکومت اس مد کو باقی مدات پر فوقیت دینے کی شرعاً پابند ہے۔

۳۔ جو لوگ سرکاری یا نجی اداروں میں ملازم ہوں ان کو ضرورت کے وقت قرضے فراہم کرنا ان محکموں یا اداروں کا فرض ہے جن میں وہ خدمات انجام دیتے ہوں۔ اجیر خاص (جو کسی اور جگہ کام نہ کر سکتا ہو) کی کفالت آجر کی شرعی ذمہ داری بھی ہے اور اس سے آجر اور اجیر کے باہمی تعلقات خوشگوار ہونے کی وجہ سے کارکردگی اور پیداوار پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ حکومت قوانین و قواعد بنا کر اس نظام کو قانوناً نافذ کر سکتی ہے۔

۴۔ وہ لوگ جن کو اپنی ضروریات کے لیے وقتی طور پر قرضوں کی ضرورت ہو اور وہ کسی محکمے یا ادارے کے ملازم نہ ہوں بلکہ عام صارفیں ہوں اور ان کے پاس ایسے ذرائع موجود ہوں جن سے وہ مستقبل میں قرضے واپس کر سکتے ہوں تو ان کو بھی قرض فراہم کرنے کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے الگ فنڈ ہونا چاہیے جس میں حکومت بھی رقم جمع کرے اور اغنیاء سے بھی اس فنڈ میں حصہ لینے کی اپیل کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

فمن توفی من المومنین فترک ربنا فعلی قضاء و من ترک مالا فلورثتہ

(صحیح البخاری کتاب الکفالہ اب الدین نمبر ۲۱۷۶)

(مسلمانوں میں سے جو شخص وفات پا چکا ہو اور اپنے اوپر اس نے قرض چھوڑا ہو (اور مال نہ چھوڑا ہو) تو اس قرض کا ادا کرنا مجھ پر لازم ہے (حکومت پر) اور جس نے مال چھوڑا ہو تو وہ اس کے وارثوں کا ہے۔)

جب نادار مقروض کا قرض ادا کرنا حکومت کا فرض ہے تو نادار لوگوں کو ان کی ضروریات کے لیے قرض فراہم کرنا بھی حکومت کا فرض ہونا چاہیے۔ اگر الگ فنڈ قائم نہ بھی ہو سکے تو ریاست کے عام بجٹ میں بھی اس کے لیے رقم مختص کی جا سکتی ہے اور وسائل کے طریقے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

۵۔ باقی رہے تجارتی اور صنعتی اغراض کے لیے قرضے جن کی ضرورت کاروباری لوگوں کو پڑ سکتی ہے تو اس سلسلے میں اصولی بات تو یہ ہے کہ جب شراکت اور مضاربت کا نظام ملک میں رائج ہو جائے گا تو بینک لوگوں کو نفع نقصان میں شراکت یا مضاربت پر سرمایہ فراہم کرے گا اور اس سے تجارت اور صنعت کو انشاء اللہ فروغ ملے گا اسی طرح حکومت بھی کاروباری لوگوں کو تجارت کے لیے مضاربت اور شراکت کے اصول پر قومی خزانے سے قرض فراہم کر سکتی ہے اور اپنے سرمائے کے تناسب سے نفع حاصل کر سکتی ہے۔

شراکت اور مضاربت کے بغیر بھی حکومت کاروباری لوگوں کو بلا سود قرضے دے سکتی ہے اور اسے دینے چاہئیں اس لیے کہ جب عوام کاروبار کریں گے تو اس سے قومی دولت میں اضافہ ہوگا اور حکومت کا بوجھ کم ہو جائے گا، روزگار فراہم کرنا تو ویسے بھی حکومت کا فرض ہے اور قومی معیشت کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ تجارت کے لیے سرکاری خزانے سے قرض دینے کی مثالیں خلافت راشدہ کے دور میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ مجاہدین کے ساتھ عراق گئے تھے۔ جب جہاد سے فارغ ہونے کے بعد بصرہ کے امیر حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ملنے آئے تو امیر بصرہ نے کہا کہ میرے پاس ایک رقم ہے جسے میں امیر المومنین کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہوں آپ دونوں اس رقم سے عراق کا کوئی سامان تجارت خرید لو اور مدینہ میں فروخت کر لو اصل رقم امیر المومنین کو دے دو اور نفع تم دونوں کا ہوگا، انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ یہ دونوں بھائی جب مدینہ پہنچے تو عراق کا مال نفع کے ساتھ بیچ دیا، نفع اپنے پاس رکھا اور اصل رقم حضرت عمر کی خدمت میں پیش کر دی، حضرت عمر نے پوچھا کہ "اکل الجیش اسلفہ مثل ما اسلفکما؟ قال لا فقال: عمر ابنا امیر المومنین فاسلفکما ادبا المال و ریحہ" کیا امیر بصرہ نے پورے لشکر کو اتنا ہی قرض دیا تھا جتنا تم کو دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا تم امیر المومنین کے بیٹے ہو اس لیے تم کو قرض دیا ہے اصل رقم کے ساتھ اس سے جو نفع ہوا ہے وہ بھی جمع کرا دو، عبداللہ تو خاموش رہا مگر عبیداللہ نے کہا امیر المومنین اگر یہ مال ضائع ہو جاتا تو اس کے ہم ہی ذمہ دار ہوتے (اس لیے کہ قرض تھا) لیکن حضرت عمر نے دوبارہ فرمایا نہیں، نفع بھی جمع کرا دو، عبداللہ تو بدستور خاموش رہے مگر عبیداللہ نے اپنی بات پھر دہرائی، حاضرین مجلس میں سے کسی نے تجویز پیش کی کہ اگر آپ اس مال کو قراضہ یعنی مضاربہ قرار دے دیں تو بہتر ہوگا۔ حضرت عمر نے اس تجویز کو منظور کرتے ہوئے فرمایا "قد جعلتہ قراضا فاخذ عمر راس المال و نصف الربح واخذ عبداللہ و عبیداللہ ابنا عمر نصف ربح المال" میں نے اس مال کو مضاربہ قرار دے دیا، چنانچہ حضرت عمر نے بیت المال کے لی اصل مال اور ادھا نفع وصول کیا اور باقی آدھا نفع عمر کے بیٹوں عبداللہ اور عبیداللہ نے لے لیا۔ (موطا امام مالک، کتاب القراض باب القراضہ، طبع مصر، ۲/۶۸۷)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ قومی خزانے کا مال قرض کے طور پر تاجروں کو دینا بھی جائز ہے اور مضاربت کے طور پر دینا بھی جائز ہے اس لیے خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے تجارتی قرض دینے پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ خصوصی رعایت کے شعبے کی وجہ سے اس مال کو مضاربہ قرار دے کر آدھا نفع بھی بیت المال کے لیے وصول کر لیا۔ یہ حضرت عمر کا کمال تقوی اور ورع تھا ورنہ ان کے بیٹے عبیداللہ نے جو یہ کہا تھا کہ اگر یہ مال ضائع ہو جاتا (یا تجارت میں خسارہ ہو جاتا) تو اس کے ضامن ہم ہوتے یعنی اپنے پاس سے یہ قرضہ ادا کرتے، لہٰذا اس کا نفع بھی ہمارا حق ہے۔ یہ بات اس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق تھی کہ الخراج بالضمان یعنی جو شخص نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے فائدہ اٹھانا بھی اس کا حق ہے۔

(ابو داود فی البیوع باب من اشتری نمبر ۳۵۰۸)
ترمذی فی البیوع نمبر ۱۲۸۵، ۱۲۸۶)
(نسائی شریف فی البیوع باب الخرج بالضمان)

(ابن ماجہ فی التجارت باب الخراج بالضمان)

(مسند احمد ۴۹/۶، ۸۰، ۱۱۶، ۱۶۱، ۲۰۸، ۲۳۷)

اس حدیث کے مستند حوالے میں نے اس لیے تفصیل کے ساتھ تلاش کر کے دیے ہیں کہ معاشی مسائل کی متعدد جزئیات میں اس کو دلیل بنایا جا سکتا ہے اور یہ ایک مسلمہ فقہی قاعدہ بن گیا ہے۔ بہر حال اس وقت اس حدیث کو اس بات کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ حکومتی خزانے سے بھی بلا سود تجارتی قرضے جاری ہو سکتے ہیں اور جاری ہونے چاہئیں۔

دوسری مثال حضرت عمر ہی کے دور خلافت کی ہے جسے ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری) نے "تاریخ الامم والملوک) میں اس طرح نقل کیا ہے۔

عن زید بن اسلم عن ابیہ قال ان ھند بنت عتبۃ قامت الی عمر بن الخطاب فاستقرضتہ من بیت المال اربعتہ آلاف تتجر فیھا و تضمنھا فاقرضھا فخرجت فھا الی بلاد کلب فاشترت وباعت"

(تاریخ الامم والملوک، طبع مصر، ۲۹/۵۔۳۰)

ہند بنت عتبہ (ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی اور معاویہ کی والدہ) حضرت عمر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور ان سے بیت المال کی رقم سے چار ہزار کا قرض مانگا تا کہ وہ اس سے تجارت کر سکے اور اس کی واپسی کی ذمہ دار ہو گئی، حضرت عمر نے مطلوبہ قرض دے دیا۔ چنانچہ وہ بنو کلب کے ملک میں گئی اور وہاں پر خرید و فروخت کی۔

اس تجارت میں انہیں خسارہ ہو گیا تھا لیکن حضرت عمر نے فرمایا اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا تو معاف کر دیتا لیکن بیت المال کا مال معاف نہیں کر سکتا۔

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

گذشتہ سوالوں کے جواب میں "ربا" کی حقیقت کے سلسلہ میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کی روشنی میں اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے، یعنی قومی ضروریات کی تکمیل کے لیے حکومت کی جانب سے جاری کردہ قرضوں پر سود بلا شبہ ربا میں داخل ہے۔ کیونکہ سود جس طرح انفرادی طور پر حرام ہے اسی طرح اجتماعی طور پر بھی۔ جس طرح عوام کے لیے سود کا لین دین قطعاً حرام ہے اور اس طرح حکومتی سطح پر بھی سود یقیناً حرام ہے۔

وہ دلائل جو پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں ان کی طرف مراجعت اگرچہ اس موقف کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ مگر مزید توضیح کے لیے چند نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

۱۔ تجارتی سود کی بحث میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ عرب میں کئی قبائل باہم سودی کاروبار کیا کرتے تھے مثلاً بنو عمرو بن عمیر بن عوف، بنو المغیرہ سے قرض پر سود لیا کرتے تھے، ان قبائل کی حیثیت اس زمانہ میں کچھ ایسی تھی جیسے اس دور میں ایک بڑی مملکت کی ریاستیں۔ اسلام نے آ کر قبائلی سطح پر اس سودی کاروبار کا خاتمہ کیا۔

۲۔ تجارتی سود کی بحث ہی میں ہم وہ واقعات تحریر کر چکے ہیں جن میں بیت المال سے حضرت عبداللہ، حضرت عبیداللہ، ہند بنت عتبہ، اور حضرت عمر فاروق کا تجارتی مقاصد کے لیے قرض لینا ثابت ہے۔ بیت المال کی حیثیت اس دور میں قومی خزانے کی تھی، گویا حکومتی سطح پر

قرضوں کا اجراء کیا گیا، مگر اس کی صرف دو صورتیں رکھی گئیں۔ صرف قرض یا پھر قراض مضاربت کی شکل میں نفع نقصان میں شرکت، بیت المال سے سود کے لین دین کی نہ مثال دی جاسکتی ہے اور نہ کوئی مسلمان صحابہ کے دور میں اس کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔

۳۔ ابن جریر نے تفسیر طبری میں نقل کیا ہے کہ :

بنو عمرو بن عمیر بن عوف، بنو مغیرہ سے قرضوں پر سود لیا کرتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد بنو المغیرہ نے اسلامی احکام کے مطابق سود دینے سے انکار کیا تو بنو عمرو نے بنو مغیر کے خلاف مکہ کے گورنر حضرت عتاب بن اسید کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا کہ ہمیں سابقہ واجب شدہ سود دلوایا جائے، حضرت عتاب بن اسید نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ تحریر کیا، جس پر وحی نازل ہوئی اور یہ آیت اتری:

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربا ان کنتم مومنین، فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ و ان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لا تضلمون ولا تظلمون۔ **(البقرہ ۲۷۸، ۲۷۹)**

یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو، پھر اگر تم اس پر عمل نہ کرو تو اعلان جنگ سن لو، اللہ اور اس کے رسول کا، اگر تم توبہ کرو تو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی دوسرا تم پر ظلم کرنے پائے گا۔)

معلوم ہوا کہ اسلامی مملکت میں حکومتی سطح پر لین دین تو درکنار ہے، حکومت کے سامنے اگر سود کے بارے میں مقدمہ پیش کیا جائے تو وہ مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں فیصلہ کرے گی۔ یعنی سود ترک نہ کرنے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہوگا۔ (دیکھیں آیت کا ترجمہ اور تفسیر)

4۔ اسلامی مملکت کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ وہ فلاحی اقدامات اور ترقی کے معاملات سے بھی پہلے ان جرائم کا خاتمہ کرے جنہیں قرآن و سنت نے سختی سے حرام قرار دیا ہے اور جنہوں نے معاشرہ کو گھن کی طرح چاٹ رکھا ہے ان جرائم میں چوری، ڈاکہ، قتل، اغواء، ربا اور زنا جیسے جرائم سر فہرست ہیں۔ کیا یہ بات سوچی جاسکتی ہے کہ یہ جرائم انفرادی سطح پر تو قابل تعزیر ہوں اور حکومتی سطح پر ان کی اجازت دے دی جائے؟ اس لیے اسلامی حکومت کی طرف سے سودی قرضوں کے اجراء کا اسلام میں کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔

۵۔ اسلامی مملکت کی طرف سے جاری کردہ قرضوں پر سود کا لین اسلامی مملکت کے تصور سے بنیادی طور پر متصادم ہے۔ سود کے سلسلہ میں ایک "اسلامی حکومت" کا کیا موقف ہونا چاہیے یہ درج ذیل اقوال سے معلوم ہوگا:

(الف)۔ حضرت عبداللہ بن عباس آیت فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (یعنی اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ) کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ **فمن کان مقیما علی الربا لا ینزع رضی اللہ عنہ، فحق علی امام المسلمین ان یستتیبتہ فان نزع و الا ضربل عنقہ** (ابن جریر تفسیر طبری ج ۳، ص ۱۰۸) یعنی جو شخص ربا (سودی لین دین) پر جما رہے، اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو تو امام المسلمین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اولاً اس شخص کو توبہ پر آمادہ کرے ورنہ گردن اڑا دے۔

(ب) قتادہؒ کہتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو (جو کسی قیمت پر سود سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوں) قتل کی دھمکی دی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ مباح الدم ہیں جہاں بھی پائے جائیں۔

(ابن جریر: طبری ج ۳، ص ۱۰۸)

(ج)۔ کتب تفسیر و حدیث اور کتب فقہ کی مراجعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں "ربا" گناہ کبیرہ ہے (ابن جریر) اور بعض احادیث میں اس کا شمار سات بڑے گناہوں میں کیا گیا ہے۔ (بخاری و مسلم) اگر قرآن و حدیث کی صریح نصوص کے باوجود کوئی شخص ربا کو حلال سمجھے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ وہ اسلام کے قطعی احکام کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں، اور اگر کوئی شخص "ربا" کو حرام سمجھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کرے تو اسلامی حکومت ایسے شخص کو مناسب سزا (تعزیر) دے سکتی ہے۔

و المسلم يبيع الخمر و ياكل الربا يعزر و يحبس (**فتاوی عالمگیری عربی ج ۲، ص ۱۶۹**)

یعنی وہ مسلمان جو شراب بیچتا ہو یا سود کھاتا ہو اسے سزا دی جائے گی اور قید کر دیا جائے گا۔

ان مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی مملکت سودی قرضوں کا اجراء نہیں کر سکتی، بلکہ اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ حدود مملکت کے اندر "ربا" کے خاتمے کے لیے جملہ تدابیر اختیار کرے۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

قومی ضروریات کے لیے حکومت کی طرف سے جاری کردہ قرضوں پر سود کا حصول ربا کی تعریف میں آتا ہے (اس کے لیے سوال نمبر ا کا آخری حصہ ملاحظہ ہو) اس کے برعکس اسلامی نظام معیشت کی رو سے بیت المال پر یہ لازم ہے کہ تجارتی مقاصد زرعی اور دوسری نجی اور اجتماعی ضروریات کے لیے کفایت عامہ کے فنڈ سے بلا سود قرضے جاری کرے۔

(اسلام کے معاشی نظریے ۵۲۵/۲

اسلام کا قانون محنت و اجرت ۶۱

تاریخ طبری بحوسلہ ۲۳ھ، ۲۷۶۶)

بلکہ اگر مقروض میعاد گزرنے کے باوجود مذکورہ قرض ادا نہ کر سکے تو بیت المال کا فرض ہے کہ اس قرض کو "مالی مدد" کی شکل میں دے کر اس کو معاف کرے۔ (اسلام کا قانون محنت و اجرت ۵۶)

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

(الف) اصل بات تو یہ ہے کہ اگر انفرادی یا قومی ضروریات کا حقیقی تجزیہ کیا جائے تو کوئی ضرورت جس کے لیے آج کل قرضے لیے جاتے ہیں، ضرورت ہی نہیں ہوتی، لیکن ضرورت کو حقیقی بھی تسلیم کر لیا جائے تو حکومت کی جانب سے سود عطا کرنے اور ایک فرد کی طرف سے سرمایہ دار کو سود دینے میں صرف اس قدر فرق ہے کہ ایک صورت میں ایک فرد سود دیتا ہے اور دوسری صورت میں افراد کا مجموعہ سود دیتا ہے۔ قرآن و سنت میں کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ اگر کوئی فرد ایک فعل کا ارتکاب کرے تو وہ جرم ہو اور اگر افراد کی کوئی فوج اس کا ارتکاب کرے تو جرم نہ ہو۔

در حقیقت حکومت اور سوسائٹی کی طرف سے یہ جرم مزید گھناؤنا اس لیے ہو جاتا ہے کہ اس جرم کو اللہ اور رسول کے ساتھ اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک فرد کے اعلان جنگ کے مقابلے میں پوری فوج یا سوسائٹی کا اعلان جنگ بہت زیادہ خطرناک اور باغیانہ ہے۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اسلامی حکومت کا اہم نصب العین تو قرآن مجید نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ٹھہرایا ہے، اگر حکومت خود سودی کاروبار کرے تو اس کے پاس کیا اخلاقی جواز ہو گا کہ وہ دوسروں کو منع کرے۔

(ب) قرآن کریم کا اشارہ یہ ہے کہ سودی نظام کا مقابلہ نظام عشر وزکواۃ کے ذریعے ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ماہرین شماریات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ نظام عشر وزکواۃ اگر مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے تو حکومت کے پاس اس قدر دائمی فنڈ جمع ہو جائے گا جس کے بعد کسی اسلامی حکومت کو کسی قومی یا بین الاقوامی قرض کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

اسلامی نظام مملکت میں مملکت کے جو مقاصد ہیں ان میں اقامت صلوۃ، ایتائے زکواۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر ہیں، جن میں تعلیم اور عدل بھی شامل ہیں۔ یہ ایسے امور ہیں جن کے لیے مالیت کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے تجویز کیا کہ تمام اسکیمیں جن کے ذریعے عوام کو سہولیات فراہم کرنا مطلوب ہوتا ہے وہ اکثر اوقات نفع بخش ہوتی ہیں، مثلاً واپڈا، پی آئی اے، ریلوے، وغیرہ حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسی سہولیات کا کام بینکوں کے حوالے کر دے، یا ان اداروں کو مالی اداروں کی شکل میں تبدیل کر دے۔

نیز عشر وزکواۃ کے فنڈ کو محض خیرات کے طور پر تقسیم کرنے کا سلسلہ بند کرنا چاہیے کیونکہ اس سے غیر مستحق افراد استفادہ کرتے ہیں، اس قسم کے فنڈ سے حکومت بھی اپنی حقیقی ضروریات کے لیے قرض حسن لے سکتی ہے اور لوگوں کو بھی یہ امداد قرض حسن کے طور پر دی جا سکتی ہے۔

جب سودی نظام ختم ہو گا تو لوگ اپنی رقومات بطور امانت بینکوں کے ہاں رکھوائیں گے محض حفاظت کے نقطے سے ایسی رسومات کا ایک بڑا حصہ ہر وقت حکومت کے لیے بطور قرض موجود رہے گا۔

Dr. Nejat Ullak Siddiqui:

Yes, the interest on loans floated by the Government to meet national requirements comes under riba.

The Prophet (p.b.u.h.) did borrow to meet the national requirements of Muslims but he repaid only the principal and made it clear to the lender that there could be no worldly 'reward' except gratitude.

> "Ismail son of Ibrahim son of Abdullah, son of Abu Rabi'ah al Makhzumi has reported to us from his father who reported about his grandfather that when the Prophet was to attack Hunayn he borrowed thirty or forty thousand from him. He repaid it when he came back. Then the Prophet (p.b.u.h.) told him: May Allah bless you with prosperity in your family and in your property. The proper recompense for lending is repayment and gratitude."
>
> (Ibn Maja: *Sunan* Tradition No. 3424, Kitabul al Sadaqat, Bab Husn at Qada. See also Nasai, Sunan, Chapter 44, Tradition No. 97 and Ahmad bin Hanbal. Musnad, Vol. 3, p. 305, Beirut, Dar al Fikr 1978).

As a matter of fact the prohibition of riba in the Quran is absolute: the identity of the lender or borrower. The purpose of loan, its quantity or duration, etc. docs not affect the prohibition at all. Floating a loan is neither the only nor the best way of meeting national requirements. There are needs which should be met by taxation, whereas some

others can be met by the Government buying goods and services on deferred payment basis. Mobilising private savings on a profit-sharing basis can also suit some national requirements. The ease with which Governments can borrow and roll over debts in interest-based system has already resulted in fiscal irresponsibility with grave consequences for the people.

Banks as enterprises which are established to make money for their owners and depositors are not suited for granting loans without interest for various requirements. Lending without interest is a charitable act not a business activity. Banks established as profitable business can practise charity only to the extent the shareholders and depositors so desire.

If Banks are established by the State to serve certain social purposes, provision can be made for granting interest-free loans for certain purposes like education, and meeting medical contingencies, etc. But in that case the required resources will have to be provided by the Government. The literature on interest-free banking does envisage some limited scope for short term interest-free loans being granted by even ordinary banks against the permission to use part of public's demand deposits for profitable purposes, at their own risk. The acceptance or rejection of such suggestions does not affect the basic position stated above. In an Islamic set-up efforts should be made to meet the financial needs of various sectors of the economy through permissible modes of finance such as profit-sharing, rent-sharing, product-sharing, prepaid orders (salam and istisna), leasing and murabaha. Only needs that cannot be met on these bases should be met through interest-free lending (or outright grants, as the case maybe).

In the case of some interest-free loans being granted by banks, it is permissible to recover the actual cost of administering the loan from theborrower as a 'service charge'. It is however highly desirable for Islamic society to avoid doing so. The resources mobilised to serve a social purpose through interest-free loans should rather be enlarged to cover the administrative costs involved. The reason for this recommendation is to forestall the possibility of 'service charge' growing into charging interest.

It is not necessary. to stick to the present structure and function of banking institutions. It is possible to separate the investment making function from the function of keeping demand deposits and performing other services against a fee.The function of granting loans without interest for various requirements can also be assigned to a special kind of 'bank', established for this very purpose.

Mr. Hassanuz Zaman

In the Our'an prohibition of interest is absolute. As stated in answer to Q.1. The rule is that العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب . Thus change in party or purposeof loan would not affect the prohibition. Fuqaha have reported a number of instances of the application

of prohibition even in Government transactions. For example Al-Sarakhsi has reported that:

(a) Anas ibn Malik has reported that a finely made royal utensil was brought to (Caliph), Umar who sent it to me for sale. I sold it for a higher quantity in terms of the same metal (gold/silver) of which the utensil was made. When I informed the Caliph about the deal he disagreed with excess quantity of gold/silver charged by me. (Sarakhsi Al-Mabsut, Vol 14,p.4).

(b) Abdullah b. Salma has reported that the Holy Prophet (pbuh) assigned to Sad and another companion with the same name to sell out (some items of *ghanima* for gold. They sold 4 mithqal of gold ore for 3 mithqal of gold coins. The Holy Prophet (pbuh) (on knowing this) observed: "You have taken riba (interest); return it", (Ibid, pp. 6-7).

(c) Ibn Masood, incharge of Bayt-al Mal at Kufa, has reported that he used to sell out the balances of Bayt-al-Mal on the spot charging an addition (in exchange). When he called on Caliph Umar the latter enquired about it and (knowing the detail) observed: that is riba. (Sarakhsi : AI-Mabsut, Vol. 14, p. 8).

The above instances suggest that the Government is also not exempted from the application of prohibition.

The question perhaps aims at finding out the alternatives to interest-bearing Government borrowings. If so the question cannot be confined to borrowing from banks; it shall have to be discussed in a broader canvass. Presently Government borrows from central bank, commercial banks, public and foreign sources. As regards government requirements distinction should be 'made between:--

(a) requirements of productive and profit yielding nature;
(b) requirements of raising infrastructure for socio-economic growth and of development activity;
(c) requirement of social welfare;
(d) Administration.

The last two are financed through general budget and will continue to be met through the same source further supplemented by substantial proceeds of Zakat. Requirements of productive or commercial nature can be met by interest-free commercial banks on the terms and conditions that it would offer to private sector.

The problem would arise in the case of financing the infrastructure for economic growth and of development activities. The solution to the problem requires the following prerequisites to be met:

(1) Interest is completely prohibited.
(2) The country is being run under more or less Islamic system by honest and scrupulous rulers and bureaucracy striving to achieve overall socio-economic progress and welfare.
(3) An overwhelming majority of sahib nisab Muslims pay their Zakat most of which is received in the Bayt-al-Mal,

(4) Quite a large number of Muslims, population is conscious of its responsibilities towards other persons and the society. Social responsibility includes the duty of each Muslim to learn and to others to enjoint upon *maruf* and prohibit from *munkar*, to physically and financially for noble causes (Jihad).

(5) People are willing to cooperate and make sacrifice for achieving social benefits.

The above prerequisites, if met, would favourably influence the resource position of the Government by transferring some important social services to private sector and thus relieving the Government budget. The consciousness of social responsibility of participating in Jihad if tapped properly would provide voluntary manpower for defence and internal security thus reducing the defence budget. As a matter of fact the Our'anic injunctions:

"O Prophet! Exhort the believers to fight." (8: 65) and;
"Make ready for them all then canst of (armed) forced and of horses tethered that thereby ye may dismay the enemy of Allah and your enemy; and others besides them whom ye know not. Allah knoweth them. Whatsoever ye spend in the name of Allah it will be repaid to you in full and ye will not be wronged." (8:60).

are suggestive of the collective responsibility of Muslims to exert physically as well as financially towards achieving this object. The financial contribution made by Muslims is repaid by Allah in the hereafter, let alone a financial reward in this world. This concept would not altogether eliminate the necessity of a standing army nor would it reduce expenditure on military hardware; it would replace a sizable manpower by trained volunteer force that may be available at need. The savings thus; effected may be used for infrastructure and development. This would be in addition to the borrowings that Government makes from banks. Presently these borrowings involve interest. In an Islamic system these borrowings would be interest-free and thus encourage these banks to concentrate more on productive investments in the private sector on profit -sharing basis which is so far being neglected because of temptations provided by a risk-free fixed return from the public sector. This diversion in bank resources leading to higher investment of commercial and productive enterprizes would, in the long run result in

increasing the sources of Government revenues rather than depending on borrowings. In addition to the change in approach proposed in the above lines the Government may also privatize a number of long gestation development projects on such terms and conditions as may be attractive to the corporate sector.

The measures proposed in the above lines may go a long way in meeting a substantial portion of requirements for infrastructure and development.

Dr. Ramzan Akhtar

(i) Yes, the Ouranic injunctions regarding the prohibition of interest are in general. The interest is prohibited both in the public and private sectors and for all types of purposes. Any excess payment made over and above the principal amount is Riba and is thus Haram. For more detail see the answer to the question (1).

(ii) The Islamic Banks will finance viable investment/production projects on the basis of Musharkah/and or Mudarabah. As for the financing of genuine consumption needs on the basis of Oarz-e-Hasna is concerned, the following considerations will have to be kept in view:

(a) The amount of loan cannot exceed reasonable limits.

(b) Income accruing from the collateral like land or house will be deducted from the amount of loan.

(c) If the debtor is unable to pay back the loan or he dies and there is no known way to pay his loan, then Bait-u l-Mal will make payment of the loan to the bank.

Dr. Ala'eddin Kharofa

(i) If the Government promises a certain percentage (i.e % 5 or more or less) the transaction will be under (Riba). But if the Government will borrow from its citizens any amount and do business under Islamic rules (i.e. Mudharabah or any kind of Islamic companies) this would be legitimate:

(ii) If the loan was, for example, for buying a house, the borrower can be a partner with the bank, and he can live in the house alone on condition that he has to pay the share of the estimated rent of the house to the bank. The Capital still is in his disposal as a debt. The same rules can be applied on borrowing to buy a car, or to do any business. The banks have to study the requirements of the individual separately and decide accordingly.

Mr. Nawazisli Ali Zaidi

(i) Interest on loans floated by Government also comes under Riba according to the definition against question number one.

(ii) An answer has been given in reply to question number two.

Mr. AI. Arsliad Javaid

(i) Interest on Government Loans, for whatever purpose these loans are floated is nothing hut 'Riba' according to what has been stated in '1' above.

(ii) Perhaps the Banks under an Interest-free set-up will not be able to grant any loan without interest for various business requirements. The Banks will have to stop their lending business as such, and will have to assume some other role as stated under ‘2' above. Instead of lending the Banks will have to become partners in business.

Mr. Zia-ul-Haq

(i) Interest on loans floated by the Government for national purposes, comes under *rbia.*

(ii) No comments.

Mr. lmtiaz Pervez

MODARABA FINANCING

Modaraba is a contract between an Islamic Bank and client whereby the Islamic Bank provides specific amount of funds to the client for an enterprise for defined purposes in exchange for a reasonable and highly predictable profit. The client receives a share in the profit as compensation or fee for his knowhow and management.

ACCOUNTING TREATMENT

Income from Modaraba relationship is taken in the books of Islamic Bank when actually realised. Income may also be booked when it is recognised or there is reasonable certainty of its realisation after it has been duly determined and quantified.

MUSHARAKA FINANCING

It is the same financing contract as Modaraba except that the client also provides a part of capital in addition to management and knowhow. On the other hand, Islamic Bank may also contribute in the management and knowhow in addition to its capital. In that

case, management fees and distributable profit from the enterprise are shared by the client and Islamic bank in accordance with ratios fixed under the Musharaka contract. This mode of financing also the same relevant implications as listed under Modaraba Financing.

MORABAHA FINANCING

Under this contract, Islamic Bank purchases goods, raw material, equipment, machinery or any other items of economic significance from a third party at the request of a client and sells such goods to the client on spot or deferred payment basis at its own sale price. The difference between the purchase cost of the Islamic Bank and the sale price to the client forms the profit available of the Islamic Bank form the relationship.

REPORT OF BANKING DELEGATION (SUBMITTED BY MANSOOR AHMAD, ADVOCATE)

Modaraba in this case is constituted by two parties: first party is type of owner of funds to be invested (called Rabb-ul-Mal), and the second party is the expert in investment the one in charge of labour, and called Modarib. Modaraba does not mean a hazardous action taken in markets ill order to raise or reduce the price of a commodity as it is the case in Western economy, but it means an Islamic Investment Company. Modaraba Company is also called by certain scholars 'Qirad'. This company was set up since Allah has created people, there being no equalitybetween them: some people have money but no experience, other have experience but no money. Those who have money need those, who knowhow to invest it and vice versa, there is then a complimentary relationship between them. Modaraba has been established as per a verse from Holy Ouran "While others travel in the land in search of Allah's bounty". So, travelling in the land is the action to seek to acquire means of subsistence through trade operation. It is in accordance with this principle that people who put their funds at the disposal of Islamic Banks to be invested are Arabab-AI-Mal. The Islamic Bank which is in charge of investing such funds through its expertise is the Modarib. That is why Shariah rules relative to Modaraha shall be determined prior to the start of operations. The percentage may be a half, one-quarter, one-third etc. Shariah's provisions have determined also that financial losses shall he incurred by the party providing funds. However if it proven that Modarib has neglected, misused or breached any provision laid down by Rabb-ul-Mal, the Mudarib shall be liable for the financial losses. (95-96).

Question No.4. Can, in the light of the Injunctions of Islam, any differentiation be made between private and public banking in respect charging of interest on banking facilities or services rendered?

سوال نمبر ۴: کیا اسلامی احکام کی روشنی میں بینکوں کی فراہم کردہ سہولتوں یا خدمات کے عوض سود کی وصولی کے سلسلے میں نجی اور سرکاری بینکاری میں کوئی امتیاز کیا جا سکتا ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

سود کے سلسلے میں نجی اور سرکاری بینک کاری میں امتیاز کا مسئلہ

نہیں جناب، سود مطلقاً ممنوع ہے، اس سلسلے میں نجی اور سرکاری کا کوئی فرق نہیں ہے، جب سرکاری بینک سود وصول کریں گے تو نجی بینکوں کو اس سے روکا جا سکے گا؟۔ دلائل پہلے دیے جا چکے ہیں، باقی رہیں خدمات تو ان کا معاوضہ نجی بینک بھی لے سکتے ہیں اور سرکاری بینک بھی لے سکتے ہیں مگر قرض پر معاوضہ نہیں لے سکتے، اس لیے کہ یہ معاوضہ نہیں ہے بلکہ سود ہے۔

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

اوپر جو تفصیل عرض کی گئی ہے اس سے سوال نمبر ۴، کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے، جس میں پوچھا گیا ہے کہ کیا سود کی وصولی کے سلسلہ میں نجی اور سرکاری بینک کاری میں کوئی امتیاز کیا جا سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ سود کی حرمت کے معاملہ میں ان دونوں میں شرعاً کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح نجی طور پر سودی لین دین حرام ہے اور قابل گرفت ہے، اسی طرح سرکاری سطح پر بھی سودی لین دین حرام اور قابل مواخذہ ہے۔ جس کے دلائل اوپر گزر گئے ہیں اور وہ سود کی ہر صورت کو علی الاطلاق حرام قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

سود کے وصول کے سلسلہ میں سرکاری اور غیر سرکاری بینک کاری میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً بنو مغیرہ اور بنو ثقیف کے درمیان تجارتی کاروبار اور اس پر آنے والے زائد نفع کو ربا قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عباس اور بنو مغیرہ کے ایک شخص کے کاروبار (جبکہ ان سے لوگ قرضے وصول کرتے تھے) اور ان کی طرف سے ادا شدہ قرضوں پر سود کی وصولی کو ربا قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک قسم کے غیر سرکاری سودی ادارے تھے۔

(در منثور ۲/۳۶۴۔ معارف القرآن ۱/۶۵۴)

اس کے علاوہ دور خلافت راشدہ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں ایسی نظیر نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ سرکاری بینک کاری کے تحت سود وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر صرف بنو عباس کے دور کے بینک کاری کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں قرض کے طور پر مالی فنڈز فراہم کرنے کے شواہد تو ملتے ہیں لیکن ان قرضوں پر سود کی وصولی کی نشاندہی کرنا ناممکن ہے۔

(عباسی کے دور کے انفرادی نظام بینکاری پر ایک نظر، الحق، نومبر ۱۹۸۵ء)

مولانا سید معروف شاہ شیرازی صاحب

سود لینے اور دینے کے سلسلے میں نجی اور سرکاری بینک کاری میں کوئی فرق نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ریاست میں ریاست کسی بھی صورت میں ایک کاروباری ادارہ نہیں ہوتا، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ تمام بینکوں کو نجی فرموں یا گروپوں کو دے دیا جائے اور ساتھ ساتھ ان کو کاروبار کی اجازت دے کر تجارتی کارپوریشنوں میں سے کوئی کارپوریشن بھی دے دی جائے، تاکہ یہ افراد بینکوں کے ذریعے سرمایہ فراہم کریں اور کاروبار کے ذریعے منافع کما کر کھاتہ داروں میں تقسیم بھی کرتے رہیں، ہاں ایسے تمام بینکوں پر لازم کر دیا جائے کہ وہ حکومت کو "کولڈ بانڈز" کے ذریعے قرضے فراہم کریں اور بغیر سود کے کسی بھی ایک سونے کی شکل میں قرض وصول کریں۔

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

Islamic law does not differentiate between private and public persons or institutions in-matters of halal and haram. In the light of the injunctions of Islam no differentiation canbe made between private and public "banking in respect of charging of interest on banking facilities- or services rendered.

It is also obvious that the wrong and oppressive nature of interest demanded from the borrower is not affected by the identity of the lender, be it private or-public.

Furthermore, the literature against interest based banking indicates many ill-effects (mafasid) of the system with which public banking in respect of charging interest cannot, therefore, be made even on the basis of maslaha(good effects).

Mr. HassanuzZaman

As already discussed-above the Our'anic injunction on interest is general which can accept only those exceptions that are provided in the nass or where the cause of exception is made out convincingly.

Mr. Ramzan Akhtar

Public and private banking institutions are treated at par in respect of the Islamic injunction of prohibition of interest. No interest is allowed on any financial transaction in

both public and private banks. However, the banks both in public and private sectors can charge service charges to take care of administrative expenses.

Dr. Alauddin Kharofa

If the loan requires any expense it should be born by the borrower. (Similar to this in the book of "Dalil Al-Talib Lenil Al-Matalib" by M.Y. AI-Karmy, p. 37).

Nawazish Ali Zaidi

In the light of Injunctions of Islam explained in reply to question number one, there is no difference whether the banksis in private sector or in public sector. The fact is that the Holy Qur'an prohibits and condemns interest as the basis of transactions.

Mr. M. Arshad Javed

In the light of the Injunctions of Islam, Interest is Interest and no differentiation can be made between private and public sector. Of course, first of all 'Riba' will have to be defined, as already stated above and it will have to be ascertained whether Bank Interest is 'Riba' or something other than 'Riba'.

Mr. Zialll Haq

No difference can be made, in the light of Islamic Injunctions, between private and public banking in respect of charging of interest on banking facilities or services rendered.

Question No.5.

(i) Can the capital, according to the Injunctions of Islam; he regarded as an agent of production thus requiring remuneration for its use?

(ii) Does devaluation of the currency affect the payment of loans taken before such devaluation?

(iii) Can inflation causing rise in the cost/value of gold and consumer goods in term of currency have any effect on the sum borrowed?

سوال نمبر۵:

(الف) کیااسلامی تعلیمات کے مطابق سرمایہ کو پیداوار کا ذریعہ تصور کر کے اس کے استعمال پر کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے؟

(ب) کیا کرنسی کی قیمت میں کمی اس قرض پر اثر انداز ہوتی ہے جو اس کی کمی سے پہلے لیا گیا ہو؟

(ج) کیاافراط زر کی بناپر سونے کی قیمت میں اضافے اور کرنسی کے حساب سے استعمالی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کا قرض پر لی ہوئی رقم پر اثر پڑتا ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

زر نقد کے استعمال پر معاوضہ ربوا ہے

نہیں جناب۔۔ زر نقد کے استعمال پر معاوضہ (کرایہ) لینا سود ہے اور حرام ہے۔ اس سلسلے میں پہلی اور اصولی بات تو یہ ہے کہ قرآن و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں قیاس اور عقلی دلائل کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جب نصوص سے یہ ثابت ہے اور امت کا اس پر پہلے سے اجماع موجود ہے کہ قرض مال پر اضافہ ربوا ہے اور دائن کو راس المال کے علاوہ ایک حبہ لینے کا حق بھی حاصل نہیں ہے تو ہم کس طرح قیاس و تصور کی بنیاد پر اس کے استعمال پر معاوضہ لینے کو جائز کہہ سکتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت کے احکام عقل کے خلاف ہیں اور ان کے اندر کوئی حکمت و مصلحت موجود نہیں ہے بلکہ صرف حکم کی تعمیل ہی مقصد ہے۔ حکیم کے احکام حکمت سے خالی نہیں ہو سکتے اور اللہ صرف حاکم نہیں ہے بلکہ حکیم بھی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے اور اس عقل سے کام لینے کا حکم بھی دیا ہے حکیم بھی ہے۔ لیکن یہ عقل اللہ و رسول کے احکام کو سمجھنے اور ان کے حکم و مصالح معلوم کرنے کے لیے دی ہے۔ ان کے کھلے اور واضح احکام کو رد کرنے یا ان میں ترمیم و تحریف کرنے کے لیے نہیں دی اور اس مقصد کے لیے اسے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ قیاس شرعی اور اجتہاد جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے لیکن نصوص (کتاب و سنت) کے خلاف قیاس و اجتہاد جائز نہیں ہے۔ ابلیس کے ملعون ہو جانے کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس نے اللہ کے حکم کے مقابلے میں قیاس کیا تھا۔ سونے چاندی اور کرنسی کو ذرائع پیداوار پر قیاس کر کے ان کا کرایہ لینا اور کرنسی کو ذریعہ پیداوار تصور کرنا ایک ایسا قیاس اور ایسا تصور ہے جو قرآن و سنت اور اجماع کے خلاف ہے جس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس اصولی بات کے دلائل اتنے مشہور و معروف ہیں کہ ان کا بیان کرنا صرف تحصیل لاحاصل ہو گا اس لیے میں دلائل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ظاہر ہے کہ شرعی عدالت کو یہ دلائل اچھی طرح معلوم ہیں البتہ عقلی لحاظ سے حرمت ربوا کی حکمت و مصلحت پر کچھ گزارشات پیش کرنا مناسب ہے جو یہ ہیں۔

نقدین یعنی سونا اور چاندی بجائے خود اپنی ذات کے اعتبار سے ذریعہ پیداوار نہیں ہیں بلکہ صرف ایک قوت خرید ضرور ہیں اور ذریعہ تجارت ہیں یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سونا یا چاندی اپنی اصل ماہیت اور ذات کے اعتبار سے نفع آور چیز بھی نہیں ہے اور اشیاء استعمال میں بھی شامل نہیں ہے اس سے نہ پیٹ بھرتا ہے، نہ پیاس بجھتی ہے اور نہ اسے لباس کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، نہ مکان کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ بیماریوں کا علاج ہے یہ تو صرف اشیاء صرف کے تبادلے کا ایک ذریعہ اور مقیاس ہے جس سے اشیاء استعمال کی قیمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ جس شخص کو نقدین یا کرنسی کے ذریعے نفع کمانا ہو تو اسے چاہیے کہ اسے خود تجارت میں لگائے یا کسی کو نفع نقصان دونوں میں شراکت یا صرف نفع میں شراکت کے اصول شرعیہ کے مطابق دے دے اگر خسارہ ہوا تو سرمائے میں کمی آجائے گی اور اگر نفع ہوا تو اسی میں اضافہ ہو جائے گا یہ عقلاً و شرعاً جائز ہے۔ آخر ذریعہ تجارت کو بجائے خود سامان تجارت بنانے اور اشیاء استعمال تصور کرنے میں کونسی معقولیت ہے جس کی وجہ سے اس کا معاوضہ اور کرایہ وصول کیا جائے اور اسے حلال سمجھا جائے۔ نقدین کے استعمال کا کرایہ ہی تو وہ ربوا ہے جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ زر نقد سے زر نقد کمانا اور اس کو سامان تجارت بنانا ایک غیر معقول اور غیر طبعی امور ہے جسے فلاسفہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مصر کے مشہور فقیہ ابو زہرہ (متوفی ۱۹۷۴ء) نے اپنے رسالے "بحوث فی الربا" میں ارسطو کا قول نقل کیا ہے کہ:

> "سود ایک ایسا طریقہ کسب ہے جس میں زر نقد زر نقد کماتا ہے جو کہ خلاف طبع ہے اس لیے کہ زر نقد س اس لیے ہے کہ وہ مبادلہ کا ذریعہ بنے"

(اردو ترجمہ ادارہ تحقیقات اسلامی، ص ۳۱)

امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) احیاء العلوم میں اس بارے میں طویل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"روپوں اور اشرفیوں کا پیدا کرنا اللہ کی ایک نعمت ہے انہی سے دنیا کا نظام چلتا ہے یہ ہیں تو پتھر جن کی ذات میں کوئی نفع نہیں ہے لیکن لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے میں ان کو واسطہ بنانے پر مجبور ہیں اس لیے کہ ہر انسان اعیان کثیرہ یعنی بہت سی اشیاء صرف کا محتاج ہے مثلاً ایک پاس زعفران ہے مگر اسے سواری کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ دوسرے کے پاس اونٹ ہے مگر اسے زعفران کی ضرورت ہے ان دونوں چیزوں کے تبادلے کی قیمت کے تعین کی ضرورت ہے کہ زعفران کی کتنی مقدار کے بدلے میں اونٹ مل سکتا ہے اور ایک اونٹ کے بدلے میں کتنی مقدار میں زعفران مل سکتا ہے۔ قیمتوں کے اس تعین کے لیے ایک تیسری چیز کی ضرورت ہے جو ایک ایک واسطے اور حاکم عدل کا فرض انجام دے سکے وہ واسطہ اور حکم یہی روپیے اور اشرفیاں ہیں جن کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ زعفران کی کتنی مقدار ایک اونٹ کی قیمت بن سکتی ہے اور ایک اونٹ زعفران کی کتنی مقدار کی قیمت بن سکتا ہے تو جو شخص روپے اور اشرفی میں وہ عمل کرتا ہے جو اس کی تخلیق کے اصل مقصد کے خلاف ہے تو وہ اس نعمت کی ناشکری اور بے قدری کرتا ہے مثلاً سونے اور چاندی کا ذخیرہ جمع کر کے اسے اپنا اصل قرض ادا کرنے سے روک دینا ان پر ظلم ہے اس کی مثال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے حاکم کو قید خانے میں بند کر دیا جائے تاکہ وہ حکومت کا فرض انجام نہ دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر پہنچا دو" اسی طرح سونے اور چاندی کے برتن بنا کر استعمال کرنا بھی ظلم ہے اور کفران نعمت ہے۔ اس کی مثال تو یہ ہے کہ حاکم شہر کو جولاہا بنا دیا جائے یا اسے کوئی اور خسیس کام کرنے پر مجبور کیا جائے اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "س شخص نے سونے یا چاندی کے برتن میں پانی پیا ہو تو گویا اس نے اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھڑکا دی ہے"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

" وكل من عامل معاملہ الربا على الدراهم و الدنانير فقد كفر النعمۃ و ظلم لانهما خلقا لغيرهما لا لنفسهما اذ لا غرض فى عينهما فذا اتجر فى عينهما فقد اتخذهما مقصودا على خلاف و ضع الحكمۃ"

(اور جو شخص روپوں اور اشرفیوں میں ربا کا معاملہ کرتا ہے وہ کفران نعمت کرتا ہے اور ظلم کرتا ہے اس لیے کہ یہ تو دوسری چیزوں کے حصول کے لیے پیدا کی گئی ہیں ان کی ذات میں کوئی غرض اور فائدہ نہیں ہے تو جب اس شخص نے اس کی ذات کو سامان تجارت بنا دیا تو ان کے اصل حکمت تخلیق کے خلاف ان کو بذات خود مقصود بنا لیا)

(احیاء العلوم ۹۶/۴۔۹۷، طبع بیروت ۱۹۸۶ء کتاب الشکر الرکن الاولی)

شیخ محمد عبدہ نے امام غزالی ہی کی تحقیق کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

ان النقدين انما وضعا ليكونا ميزانا لتقدير قيم الاشياء التى ينفع بها النا س فى يجعلون اعمالهم قاصرۃ فى استغلال المال بالمال فينموا المال و يربوا عندهم و يخزن فى الصناديق والبيوت المالىۃ و يبخس للعالمين معايشتهم فاذا تحول هذا و صار النقدس مقصودا بالاستقلال فان هذا يودى الى انتزاع الثروۃ من ايدى الناس و حصرها فى ايدى الذين قيم اعمالهم۔

(تفسیر المنار ۱۰۸/۳، ۱۰۹، طبع بیروت)

(نقدین کو اس لیے بنایا گیا ہے کہ یہ ان چیزوں کی قیمتوں کے تعین کے لیے ترازو بن سکیں جن سے لوگ اپنی زندگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں تو جب ان کی اصل حیثیت بدل دی جائے اور زر نقد بجائے خود ذریعہ آمدن بن جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت لوگوں کے ہاتھوں سے کھینچ کر ان لوگوں کے ہاتھوں میں جمع ہو جائے گی کہ جن کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ زر نقد س سے زر کمائیں اور محنت کرنے والوں کی محنت کی قیمتیں گھٹ جائیں گی۔)

سونے اور چاندی کی جگہ اب کرنسی نوٹ آ گئے ہیں جن کا صرف تجارت کا ذریعہ ہونا محتاج بیان نہیں ہے۔

اشیاء استعمال کے معاوضے اور نقدین کے استعمال کے معاوضے کے درمیان وجہ امتیاز

سودی معیشت کے حامیوں کی جانب سے یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ جب مکانات، سواریوں، زمینوں اور دوسری ان چیزوں کے استعمال کا کرایہ اور معاوضہ جائز ہے تو نقد سرمائے یعنی سونے چاندی اور کرنسی کے استعمال یعنی اسے تجارت میں لگانے کا کرایہ اور معاوضہ کیوں ممنوع ہے اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ اشیاء استعمال کا کرایہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جائز قرار دیا ہے اور زر نقد کا کرایہ و معاوضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرما دیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس فرق کی عقلی اور فلسفیانہ وجہ کیا ہے تو اس کا جواب بھی دیا جا چکا ہے کہ زر نقد بذات خود نہ ذریعہ پیداوار ہے اور نہ استعمال کی چیز ہے بلکہ قوت خرید ہے اور اشیاء ضرورت کے تبادلے کا ایک واسطہ ہے اس کی ذات میں نفع آوری کی صفت سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو اس کا استعمال کیسا ہوگا اور ان کا کرایہ کیسے وصول کیا جا سکے گا۔ مکان کا استعمال یہ ہے کہ اس میں رہائش رکھی جاتی ہے اور رہائش کے بدلے میں کرایہ دیا جاتا ہے۔ سواری کا استعمال یہ ہے کہ اس میں سفر کیا جاتا ہے اور اس کے بدلے میں کرایا دیا جاتا ہے۔ مزدور اور ملازم کا استعمال یہ ہے کہ وہ کام کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اجرت لیتا ہے جو اس کی خدمت کا معاوضہ ہے اور زمین کا استعمال یہ ہے کہ اس میں غلہ، سبزیاں اور ضرورت کی دوسری چیزیں لگائی جاتی ہیں یا اس پر مکانات، دکانیں اور کارخانے بنائے جاتے ہیں اور زمین کا کرایہ اس کے اس استعمال کا معاوضہ ہے یعنی ان چیزوں میں بذات خود نفع اور فائدہ پہنچانے کی صفت موجود ہے لہٰذا اس نفع اور فائدہ کا معاوضہ بھی ہونا چاہیے اور یہی معاوضہ ان چیزوں کے استعمال کا کرایہ ہے۔ سونے اور چاندی کا ڈھیر لگا دیجیے یا کرنسی نوٹوں سے بکس ہی نہیں بلکہ پورے مکان کو بھر دیجیے اور پھر جتنی محنت تم سے ہو سکے کر لیجیے۔ کسی بھی محنت اور تدبیر سے آپ کو ان سے نہ رہائش گاہ ملے گی، نہ کھانا ملے گا، نہ کپڑا ملے گا، نہ سواری ملے گی، نہ علم کے حصول کے لیے کتابیں ملیں گی، نہ علاج کے لیے دوا ملے گی اور نہ آپ کی کوئی اور ضرورت اس سے پوری ہو گی۔ ان سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کو جیب میں ڈالو اور مارکیٹ میں جاؤ اور ضرورت کی چیزیں خرید کر لے آؤ۔ بعض حضرات نے اشیاء استعمال کے کرائے کی عقلی توجیہ یہ کی ہے کہ ان چیزوں کے استعمال سے قیمت میں کمی آتی ہے اور انہیں نقصان پہنچتا ہے اور کرایہ و معاوضہ اس کمی اور نقصان کا عوض ہے لیکن نقد سرمائے کے استعمال سے جب وہ کسی کو قرض دیا گیا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے اور ان کی قیمت میں بھی استعمال کی وجہ سے کوئی کمی نہیں آتی اگر آتی بھی ہے تو دوسرے عوامل کی وجہ سے آتی ہے اس لیے نقد سرمائے کے استعمال کا کرایہ لینا بلاوجہ ہے۔ یہ بھی ایک اچھی توجیہ ہے لیکن میرے نزدیک یہ ثانوی درجے کی توجیہ ہے جو اکثر اشیاء استعمال میں درست ثابت ہوتی ہے لیکن زمین کو زراعت یا باغبانی کے لیے کرائے پر لینے کی صورت میں یہ توجیہ مشکوک ہو جاتی ہے۔ اصل وجہ یہی ہے کہ نقد سرمایہ تجارت اور خرید و فروخت کا ایک ذریعہ ہے بذات خود کوئی استعمال اور پیداوار کی چیز نہیں ہے اس لیے اس کا کرایہ جائز نہیں ہے اور اس تجارت اور خرید و فروخت کا نفع جائز ہے۔ جس کا یہ سرمایہ ایک ذریعہ ہے اس کے برعکس زمین کی تخلیق ہی اس لیے ہوئی ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کی جائے اور دوسری ضروریات کے لیے استعمال کیا جائے اس لیے اس کا کرایہ بھی جائز ہے اور بٹائی پر دینا اور لینا بھی جائز ہے۔ مزارعت یعنی بٹائی کا معاملہ مختلف فیہ ہے لیکن زمین کا نقد کرایہ

چاروں فقہی مکاتب فکر میں جائز ہے۔ امام نووی نے شرح مسلم باب کراء الارض بالذہب والفضہ میں امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کا مسلک یہی نقل کیا ہے کہ نقد کرایہ پر زمین زراعت کے لیے یا باغبانی کے لیے یا کسی اور جائز استعمال کے لیے دینا جائز ہے۔

و ذہب عامۃ اہل العلم الی جوازھا بالدراہم و الدنانیر

(شرح السنۃ ۸/۲۶۳، طبع ۱۹۸۳ء)

(عام اہل علم نے روپوں اور اشرفیوں کی صورت میں زمین کے کرائے کو جائز قرار دیا ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "اکروا بالذھب والفضہ" یعنی زمین سونے چاندی کی صورت میں کرایہ پر دے سکتے ہیں۔ (ابو داود فی البیوع، باب فی الزراعۃ)

اس کے جواز میں صحیح مسلم، نسائی، ترمذی اور دوسری کتابوں میں کافی احادیث اور آثار موجود ہیں لیکن چونکہ یہ اس وقت موضوع سے متعلق مسئلہ نہیں ہے اس لیے مزید تفصیل اور دلائل کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن حزم کو ایک حدیث کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے اس لیے وہ بٹائی کو تو جائز کہتے ہیں مگر نقد کرائے کو ناجائز کہتے ہیں۔ مولانا مودودی کو بھی میرا خیال ہے کہ بعض احادیث سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اپنی کتاب سود میں انہوں نے ۲۰ روپے بیگھ یا ۵۰ روپے ایکڑ جیسے کرائے اور لگان کو شبہہ ربا قرار دیا ہے اور مسئلہ ملکیت زمین میں جو رائے قائم فرمائی ہے اس میں بھی کافی الجھاؤ محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال اس وقت ابن حزم یا مولانا مودودی کی رائے پر کوئی تبصرہ یا مسئلے کی پوری تفصیل و تنقیح میرے پیش نظر نہیں ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اشیاء استعمال اور ذرائع پیداوار کا کرایہ ربوا نہیں ہے اور زر نقد کا کرایہ ربوا ہے۔

کرنسی کی قیمت میں کمی کا اثر قرض کی اصل رقم پر نہیں پڑتا۔

نہیں جناب! فقہ کا قاعدہ ہے کہ الاقراض "تقضی بامثالہا" یعنی قرضوں کی ادائیگی مثل سے ہوتی ہے یعنی جتنا لیا تھا اور جس قسم سے لیا تھا اتنا ہی اور اسی قسم سے واپس کیا جائے گا۔ قیمتوں کی کمی بیشی تو حالات کے تغیر سے ہوتی ہے ان حالات اور عوامل کو قرض دار نے تو نہیں بدلا کہ وہ اس کی تلافی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے فلکم رؤوس اموالکم یعنی "تمہیں صرف اصل رقم کی وصولی کا حق ہے" اس اصول پر زر نقد کی قوت خرید میں کمی بیشی کا کوئی اثر کسی حدیث یا قول صحابی یا قول فقیہ میں اس اثر اندازی کا ذکر میرے مطالعے میں نہیں آیا اس کمی کا اثر تو سارے لوگوں پر پڑتا ہے صرف قرض دینے والے پر تو نہیں پڑتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ رقم ایک کے پاس ہوتی تو وہ اسے تجارت میں لگاتا اور نفع کماتا اور اس نفع سے کرنسی کی قیمت میں کمی کی تلافی ہو جاتی تو اگر اس کا مقصد کسی کی ضرورت پوری کرنا نہیں تھا بلکہ نفع کمانا مقصد تھا تو اپنے سرمائے کو تجارت میں لگا دیتا یا کسی مضاربت پر دے دیتا یہ راستہ تو اس پر کسی نے بند نہیں کیا تھا ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں کرنسی کی قیمت میں کمی کے اثرات سے بچنے کے لیے یہ تجویز ہو کہ قرض دیتے وقت یہ معاہدہ کر لیا جائے کہ جب ادائیگی کی میعاد آ جائے تو یہ قرض جنس کی صورت میں واپس کیا جائے گا مثلاً ۵۰۰ روپے قرض دیا اور ادائیگی کے وقت اس رقم کی جتنی گندم بنتی ہو یا جتنا کپڑا بنتا ہو وہ دیا جائے تو اس طرح کرنسی کی قوت خرید میں کمی بیشی کا ازالہ ہو جاے گا لیکن یہ معاملہ تو پھر قرض نہیں ہو گا بلکہ بیع سلم کا معاملہ بن جائے گا۔ دو قسم کے معاملے ایک ہی چیز میں نہیں کیے جا سکتے۔ قرض ہے تو ادائیگی بالمثل کرنی ہو گی اور اگر بیع سلم ہے تو اس کی شرائط مذکورہ فی الحدیث پوری کرنی ہوں گی۔ بیع سلم کے جواز کے لیے ضروری ہے کہ جنس کی قیمت معاہدے کی مجلس میں طے کی جائے اور اسی وقت بائع کو دے دی جائے تاکہ ادھار کے بدلے ادھار کی شکل نہ بن جائے جو از روئے حدیث ممنوع ہے۔ اور جس چیز کی قیمت پیشگی دی گئی ہو اس کی مقدار، جنس، صنعت، ادائیگی کا وقت اور ادائیگی کی جگہ یہ سب چیزیں متعین کرنی ہوں گی۔

سونے کی قیمتوں اور استعمالی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کا اثر

قرض کی جتنی رقم لی گئی تھی اتنی ہی لوٹانی ہوگی۔ سونے کی قیمتوں یا اشیاء استعمال کی چیزوں کی قیمتوں میں کمی بیشی کی وجہ سے قرض کی اصل رقم یعنی راس المال میں کمی بیشی جائز نہیں ہے اور حرمت ربا کی آیات میں کسی قسم کی استثنا کی دلیل موجود نہیں ہے۔

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

(الف) اس سوال کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر معاوضہ سے مراد ربا (سود) ہے جس کی تعریف اور جس کی حقیقت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں تو یہ ہر گز نہیں لیا جا سکتا۔

اور اگر معاوضہ سے مراد وہ نفع ہے جو اسلام اصولوں کے مطابق شرکت یا مضاربت کی صورت میں نفع نقصان میں شرکت کی بنیاد پر ملتا ہے تو وہ بلا شبہ جائز ہے اور لیا جا سکتا ہے۔ اس مختصر جواب کے علاوہ سوال میں اٹھائے گئے نکتہ پر ہم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی دو تحریروں کے اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے سوال میں مندرجہ نکتہ کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

ا۔ اس سلسلہ میں قرآن و سنت کے احکام سے جو صحیح پوزیشن سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "سرمایہ کو عامل پیداوار شمار کیا گیا ہے، البتہ جس چیز کو آج کل علم معاشیات میں سرمایہ یا اصل (Capital) کہا جاتا ہے اور جس کی تعریف "پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے وہ اسلامی شریعت کے اعتبار سے دو قسموں پر منقسم ہے۔

(ا)۔ وہ سرمایہ جس کا عمل پیداوار میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے خرچ نہ کیا جائے جیسے روپیہ اور اشیائے خوردنی۔

(۲)۔ وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصل شکل و صورت برقرار رہتی ہے مثلاً مشینری۔ تقسیم دولت میں ان دو قسموں میں سے پہلی قسم کا حصہ منافع (Profit) ہے نہ کہ سود، اور دوسری قسم کا حصہ زمین کی طرح اجرت یا کرایہ (Rent) ہے۔

(حضرت مفتی محمد شفیع: سوالنامہ ربا کا جواب، بشمولہ ہمارا معاشی نظام، ص ۱۱۴، ۱۱۵ مطبوعہ کراچی)

2۔ دوسرا اقتباس حضرت مفتی محمد شفیع کی ایک چھوٹی مگر قیمتی کتاب "اسلام کا نظام تقسیم دولت" سے پیش کرنا مقصود ہے۔ چونکہ یہ اقتباس کئی صفحات پر مشتمل ہے اس لیے اسے نقل کرنے کی بجائے ان صفحات کی فوٹو کاپی ہمراہ ہے، ان صفحات میں آپ کے سوال کے اندر اٹھایا جانے والا نکتہ پوری طرح حل کیا گیا ہے۔

دولت کے اولین مستحق

جیسا کہ عرض کیا گیا، دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں، لیکن عوامل پیداوار کی تعین، ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ منظّم معیشت میں مقرر کیے گئے ہیں بلکہ بہت مختلف ہیں اسلامی نظریے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں:

(ا)۔ سرمایہ: یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خرچ نہ کیا جائے اور اسی لیے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے، مثلاً نقد روپیہ، یا اشیائے خوردنی وغیرہ۔

(۲)۔ زمین: یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے، کہ ان کی اصلی شکل و صورت برقرار رہتی ہے، اور اسی لیے انہیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً زمین، مکان، مشنری وغیرہ۔

(۳)۔ محنت : یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء وجوارح کا ہو یا ذہن اور قلب کا، لہٰذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی۔ وہ اولاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی۔ کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکل منافع (نہ کہ بہ شکل سود) ملے گا، دوسرا حصہ زمین کو بہ شکل کرایہ دیا جائے گا، اور تیسرا حصہ محنت کو بہ شکل اجرت ملے گا، جس میں جسمانی محنت اور تنظیم و منصوبہ بندی کی ذہنی اور فکری محنت سب داخل ہیں۔

اشتراکیت اور اسلام

تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے، اور سرمایہ داری سے بھی، اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، اس لیے اس میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے، اس کے برخلاف اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کیے ہیں، ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے، آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خود رو گھاس جنگل اور پانی کا شکار، معاون اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں، جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ وہ وقف عام ہیں، ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے، اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیۃً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مال کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بے شمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار حکومت کے حوالہ کرنا پڑتا ہے، جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے، اور اس طرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے، اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے، اس لیے اس کے استعمال کے لیے جبر و تشدد ناگزیر ہے، جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے، اور اس کی ذہنی صحت پر بھی، اس سے واضح ہو گیا، کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں۔ ایک فطری نظام معیشت کا قیام، اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا، بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں، ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے۔ اور ان میں "رسد و طلب" کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے، اور جسے دور کرنے کا دعوے اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام

یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے، اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے، یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے اس لیے اسے نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کیے ہیں۔ ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں:

(۱)۔ عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲)۔ سرمایہ کا صلہ "سود" کے بجائے "منافع" قرار دیا گیا ہے۔

(۳)۔ عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں "سرمایہ کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے، لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے، لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں خرچ کیے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں یا بالفاظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا، مثلاً روپیہ لہٰذا مشینری اس تعریف کی رو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں۔

(۴)۔ اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے، یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لیے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہو گئی ہے۔

(۵)۔ محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے، اور اس میں ذہنی محنت، تنظیم اور منصوبہ بندی بھی شامل ہو گئی ہے۔

آجر سرمایہ اور محنت سے الگ نہیں

اسلام کے نظریہ تقسیم دولت کے مذکورہ بالا امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کر دی ہے، جس کے نتیجے میں تقسیم دولت کے تین مد قرار پائے ہیں۔ منافع، اجرت اور کرایہ چوتھے مد یعنی سود کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے "منافع" اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا، باقی تینوں عوامل پیداوار میں سے سرمایہ کو معین سود زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اجرت مل جاتی ہے، اس لیے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ درحقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہیے، اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے، اسی کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا، اس لیے جو سرمایہ دار ہے، وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے، اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں:

(۱)۔ انفرادی کاروبار

سرمایہ لگانے والا بلا شرکت غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے، اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلائے لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا، سرمایہ لگانے کی وجہ سے "منافع" اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اجرت کا۔

(۲) شرکت

دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع و نقصان میں بھی اسے فقہی اصطلاح میں "شرکۃ العقود" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حقدار ہوں گے، اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اجرت" کے۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

(الف)۔ مضاربت کی رو سے سرمایہ کو پیداوار کا ذریعہ قرار دے کر اس پر معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً زید بکر کو کچھ رقم دیتا ہے۔ اس پر بکر کاروبار شروع کرتا ہے۔ جب کہ بکر کا کوئی سرمایہ اس میں شامل نہیں ہوتا ہے۔ منافع حاصل ہونے کی صورت میں زید کو یہ اختیار حاصل ہے۔ کہ منافع کا ایک خاص حصہ بطور معاوضہ سرمایہ وصول کرے۔ (الہدایہ: ج ۲، ص ۲۵۸)

(ب وج) دونوں صورتوں میں فلکم رؤوس اموالکم کے تحت قرض کی رقم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

(الف)۔ سرمایہ پیداوار کا ذریعہ نہیں ہے، محنت سرمایہ کو پیدا کرتی ہے اور محنت سرمایہ کی شکل میں محفوظ بھی ہو سکتی اسلامی نظریہ حیات میں عمل کا ٹھوس شکل میں وزن ہوگا۔ جب سرمایہ بذات خود محنت کی ایک ٹھوس شکل ہے، اور عین محنت ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ محنت کسی ایسی حقیقت کو جنم دے جس میں محنت نہ ہو، لہٰذا سرمایہ صرف اسی سرمایہ کو جنم دے سکتا ہے جس میں محنت شامل ہو۔

امام ابو حنیفہ نے اسی تصور کے تحت یہ کہا عقد المضارعۃ باطل کیونکہ اس میں مالک زمین کی محنت شامل نہیں ہوتی اور وہ زمین کا کرایہ وصول کرتا ہے، جب کہ زمین خود اس کی پیدا کردہ نہیں ہے۔

دور جدید کے بعض مصنفین نے (کراء الارض) کو بھی سود قرار دیا ہے اور زمین کو سرمائے کے مماثل قرار دیا ہے۔

(ب)۔ کرنسی حقیقی زر نہیں ہے، بلکہ یہ زر کا بانڈ ہے اور حقیقی زر محنت اور عمل کی ٹھوس شکل اور قدر ہے، اس میں اگر غیر حقیقی زر (کرنسی) کی وجہ سے کم ہوتی تو یہ ظلم ہے۔ لہٰذا تجویز یہ ہے کہ قرض حسن کا لین دین "گولڈ بانڈز" میں یا کسی دوسرے بانڈ میں جس سے اس وقت کی کرنسی کی قدر کا تعین ہو اور واپسی کے وقت قرض کا حساب اگر اسے کرنسی میں بدلنا مطلوب ہے تو پھر اس وقت کی موجود قدر "گولڈ" یا کسی اور جنس کی صورت میں اسے کرنسی میں بدلا جائے۔

مارک اپ کا نظام سودی نظام کے مماثل ہے۔ اگر قرض حسن یا پراویڈنٹ فنڈز اور دوسرے دیپازٹ مثلاً امانتی کھاتے جن پر راسخ العقیدہ مسلمان پہلے بھی سود نہ لیتے تھے، اگر اس قسم کے بانڈز میں جمع ہوں اور بھنانے کے وقت ان کی قیمت لگائی جائے تو کسی فریق کو نقصان نہ ہوگا اور شرعاً کوئی قباحت بھی نہ ہوگی۔ لیکن اگر آپ کرنسی کی قیمت میں ہونے والی کمی کے پیش نظر کسی شخص کو سال کے بعد مارک اپ کے نام ۱۰۷

روپے دیتے ہیں تو اگرچہ در حقیقت یہ سود نہیں ہے لیکن بظاہر یہ واضح طور پر سود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف اجناس کی صورت میں ایک سیر گندم کے بدلے دو سیر جو کا سودا جائز کیا لیکن ہاتھ در ہاتھ کی شرط لگا دی تاکہ بظاہر سود نظر نہ آئے۔

(ج) افراط زر کی وجہ سے کرنسی کی قیمت میں کمی قرض دہندہ کے عمل سے نہیں ہوتی، اس لیے قرض حسن کے فریقین کے حقوق اس سے متاثر نہیں ہونے چاہئیں۔ اور (ب) کے ضمن میں جو تجویز دی گئی ہے وہی جواب ہے اور مارک اپ کا نظام بظاہر کلیۃ سود کے مماثل ہے۔

17—05—03

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

(i) We have to distinguish between money capital and real capital i.e. capital goods such as machinery. Economists apply the term capital to both of them but their role in production is different. It is capital goods that quality participates in production. As regards money it can help the producer obtain capital goods as it can help him obtain the services of labour, the land, the raw materials, etc. The role of capital goods in the production process is known and measurable. Their use for a given period of time has, therefore, been regarded by Islamic law as a benefit which can be sold and purchased while the capital goods itself remains intact and continues to be owned by its supplier. The one who hires machinery does not owe the machinery. He buys the right to use it over a period of time. Islamic law does not allow money capital to be hired since it can be used only by exchanging it with goods and services. It does not remain intact so that it could be returned to its owner supplier after rendering its services over a period of time. The only

way the borrower can meet his obligation to repay is to convert to money whatever goods and services are available, at the time of repayment, as a result of the originally purchased goods and services having gone through a process of production (including trade). It is uncertain what this amount of money will be. It may be more than, equal to, or less than the sum of money originally used to buy the goods and services. There is no way this uncertainty can be removed as it is an essential aspect of our environment. It is this uncertainty surrounding the only way money capital can be used in production which makes it a category apart from capital goods. Since its 'use' does not and cannot result in a known a measurable benefit/service over time it is not entitled to hire-money or rental. Its entitlement has been changed by Islamic law to a share in profit in case there is profit, provided it bears the loss in case of loss. The change from rental or profit-share is called for by the different roles capital goods and money capital are capable of playing in the process of production.

(ii) Devaluation of the currency would not affect the payment of loans taken before such devaluation, in so far as the loan was transferred in that currency specifically. When the parties to the loan transactions are private person in the same currency area, the rational of the above opinion is clear. Devaluation of a currency is directed at its value in foreign currencies, though this may and often does affect its purchasing power at home, especially with reference to imported goods. It is generally done to serve the best interest of the people of a country by promoting exports and discouraging imports. To the extent some people are 'harmed' by it, not only the lender but the borrower could also have been affected (depending on when did he actually used the sum borrowed). Then, if we assume that the lender does deserve compensation whom shall we hold responsible for compensating him? It can only be the authority which devalued not the borrower who had little say in devaluation. If we ask the devaluing authority, the State to pay the compensation, it will have to collect this amount (and all such amounts) through taxation, and the administrative cost of compensating all lenders will be great. Hence we are obliged to say that the lenders should better take the risk of devaluation into consideration while lending. If they want to hedge against this risk it is open to them either to refuse to lend or lend gold or any other commodity not vulnerable to such risks.

Should a Government which has borrowed domestically (in local currency) pay back a larger amount to compensate for devaluation? The answer is, no. I think not. The reasons are the same as stated above. The decision to devaluate the currency, taken by a Government based on Shura, is a decision taken on behalf of the people of the country on consideration which have little to do with domestic debt. This decision affects the purchasing power of the currency indirectly but it is primarily designed to improve the economic health of the country in the long run from which everybody would benefit. Burdening this decision with an additional obligation on part of the Government to pay back a larger/amount may partly defeat the very purpose for which this step is taken. The decision to lend - a sum of money, be it to the Government or to a private person in an interest-free system, basically a charitable act. The lender is free to do so or not do so. It is up to him to consider the risk of

partial loss of purchasing power, through devaluation or inflation, in taking such a decision, It is not possible to recognise a claim to a larger amount than given as loan, in view of the prohibition of riba in Islam. It may, however, be argued that indebtedness may also arise out of a sale on credit, A may owe B a sum of money as the deferred price of a commodity he purchased on credit. Here is a debt arising out of an act that is not charitable. Shall A be obliged to pay B a sum higher than originally contracted for, because the purchasing power of currency has gone down? The answer, once again is no. It is always possible for B to take into consideration the possibility of decrease in the purchasing power of-currency due to inflation or devaluation while setting the deferred price of the commodity he is selling.Shariah permits him' to charge a higher than current (spot) price in case the payment is deferred. But once a sum of money is specified in the contract in case of sale on credit that sum of money be increased on any account.

(iii) Inflation causing rise in cost/value of gold and consumer goods in term of currency cannot have any effect on the sum borrowed. Inflation is the result of circumstances beyond the: control of the borrower hence he cannot be held responsible for loss of purchasing power to the lender who lent a particular sum in the local currency. Had he borrowed gold or consumer goods he would be obliged to repay the amount of gold or consumer goods he borrowed despite a rise in their costs. But in so far as the loan was contracted in currency he is obliged to pay back the amount of currency he borrowed. This also applies to the debts arising out of purchase on credit, for reasons explained in the answer to 5(2) above.

The extreme case in which very high rate of inflation renders a currency almost worthless is, however, a case apart. In such cases it can be construed that now the worthless currency is a money different from the one in which the loan was contracted. A formula establishing the 'rate of exchange' between the 'new' and 'old' currency can be devised and all earlier loans converted to the 'new' currency accordingly. Even in this case a number of difficult questions arise to which no answer is available till now. This matter was discussed by the seminar on indexation organised by the Islamic Research and Training Institute of the Islamic Development Bank, Jeddah, held in Sha'ban 14071 April 1987. Reference may be made to the recommendations of that seminar and the papers presented there.

Mr. Hassanuz Zaman

(i) Distinction should be made between monetary assets and physical assets. Physical capital which is acquired with money is productive. Money as such does not enter in the process of production. All physical assets have a price and can be hired, bought and sold. Money is a medium of exchange. It does not have a price nor can it be hired, bought and sold for the same money. It can either be invested as monetary asset or can be lent out. Return on money investment will depend on the outcome of the productive process. If the process results in increase in terms of money the investment would be entitled to a share accordingly. If it fails to earn in terms of money, it will not be entitled to receive any return, but if it is lost, the investment is lost.

If, however, money capital is advanced as a loan it will neither be entitled to any remuneration nor will it be liable to any loss. It will be redeemable in full irrespective of the performance of the investment.

(ii) Devaluation involves' the relationship of a currency with the value of other currency /ies. Devaluation of one currency in relation to another will affect the exchange value of transaction whether the transaction is of purchase/sale or of loan.

(iii) Inflation and deflation both affect the purchasing power of money whether this money is in possession of saver or borrower. During inflation purchasing power of money declines whether this money is hoarded by the saver or advanced to the borrower. It is not the act of lending/borrowing that affects the purchasing power of money.

Mr. Ramzan. Akhtar

(i) The word capital is used in two meanings: physical and financial.
Physical capitals like machinery, building etc. taking part in the production process are allowed to claim their reward in the form of rental.

Financial capital like money and near-money instruments taking part in the production process through Mudarba or Musharkah arrangements can participate in profit or loss. However, no fixed return is admissible for the use of money capital.

(iii) The question is two dimensional. One of its dimensions relates to the effect of devaluation on the internal loans. In such loans, the same amount of loan will be repayable after the devaluation as was agreed upon before the devaluation. In this case, Imam Istijabi reports the consensus of Fuqaha on the point that currency (Falus) should not be tempered. If there is any change in the value of currency, then the same amount of currency units will he rapaid as were loaned.[5]

As far the payment of external loans is concerned, the devaluation will involve extra payment proportional to the rate of devaluation on such loans. .

(iii) The answer here is essentially related to the above answer. A given sum borrowed before inflation will be repaid in the same amount, after the inflation. The inflation tends to reduce the real burden of the loan. From this angle, it tends to favour the

[5] Ibn-e0Aabideen “rasaiol”. Vol. 2 p. 62

borrower against the lender. To protect the lender, the indexation of loan is not allowed because the indexation while protecting lender, hurts the borrowers.

Real answer to the problem of inflation is introduction of the Islamic Economic System in totality. An important feature of this system in the monetary sector is prevalence of a relatively constant value of money.

Prof. Dr. Ala'eddin Kharofa

(i) The capital alone cannot produce any benefit. The production of the capital is being born by the capital and the activities of the human being. To illustrate this, we can see the following: If we are going to put one million dollars in a corner of any room and close the door of the room, then we come back to it after one year we will find it: One million dollars, no more. This indicates that the capital alone cannot bring any benefit. But if we are going to add to this, 1,000,000 the activities of a man, we may have an additional amount. Therefore, the capital alone cannot be regarded as an agent and require any remuneration. Here we have to remember the saying of Allah's "(If you repent of dealing by usury, you have only your capital, you will not oppress "People nor you will be oppressed".

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَلا تُظْلَمُونَ (2: 279)

(More details on this in my book: Al-Riba Wa Al-Fa'edah, in Arabic, published in Baghdad, 1962, pp.l07-115).

(ii) There are two opinions on this point:

(1) The devaluation of the currency does not affect the payment of the loan i.e. the borrower has to pay back the same money, the same amount, even though the currency was changed by the Government, or the Sultan, and it was stagnated, and new currency has been issued, This opinion is of Abu Hanifah (Ibn Abideen 5/H12 and: My dissertation Aqd AI-Qardh which was published in Lebanon, p. 172).

(2) The second opinion says that the borrower has to pay back the equivalent "the likeness" of the old currency. The rate of the currency has to be determined on the first date of the loan. This opinion is the opinion of Abu Yousif and Mohammad Ibn AI-Hassan from Hanafi School and Mansoor AI-Bahooti, and Ibn Qudamah from Hanbalite School. (Ibn Abedeen 5/165 and KashafAl-Oena' 3:3151 and Matalib Oli AI-Nuha 3:241 and my dissertation: Aqd AI-Oardah, p. 171).

(iii) The same answer of (ii) can apply here.

Nawazish Ali Zaidi

(i) Capital and enterprise are a combined factor of production which is implicit in the mechanism of Modarabah and Musharaka. The remuneration for 'capital' depends on what the capital actually earns.

(ii) The loan has to be repaid in the currency in which the loan was contracted. This takes care of the question of devaluation of a currency.

(iii) Verse 279 of Surah Al-Baqarah permits a lender to receive back his Ras-al-Mal (principal/capital sum) in a transaction of loan. What is 'Ras-al-Mal' is easy to determine in case of gold or any other commodity. But in case of paper currency where its purchasing power fluctuates, the Ras-al-Mal is its purchasing power. In my opinion, the principle of 'indexation' of a loan may possibly he accepted as permissible. But where and how to apply the principle of indexation, is a matter which needs to be examined in greater depth keeping in view its economic implications.

Mr. M. Arshad Javed

(i) According to the Injunctions of Islam, perhaps capital by itself is not regarded as an agent of production and hence cannot be remunerated for its use. Capital is just a catalyst that simply activates a production function. Capital put to use may bring rewards. Thus capital cannot be rewarded but the owner or user of capital may be rewarded and the reward is by virtue of taking the risk of putting the capital into use and not simply by virtue of owning it.

(ii) In the present set-up, loans are given and fixed by amount and not by purchasing power. Money is lent and not the purchasing power. As such, the borrower is required to pay back the amount of money that may be the Principal Amount alongwith the Interest which also in the present set-up is fixed and is not necessarily related to the purchasing power or value of money.

In my humble view, if we can invent a mechanism of giving 'Purchase Value Loans' in place of money loans by linking the purchase value with certain representative basic commodities, perhaps the problem of 'Riha' or 'Interest' can be solved. In this new set-up, the hanks will then not lend money; they will lend say 1,000 ‘Purchase Value Units' of 'Basic Value Item'. Suppose at the time of 'borrowing, the cost of 1000 PVU (Purchase Value Units) comes to say Rs.1,000. The Bank will thus lend the borrower Rs.10.000. Again suppose the borrower had borrowed 1000 PVU for say one year. After one year, naturally the borrower will have to pay back to the Bank 1,000 PVU. Suppose after one year, the cost of 1000 PVU comes to say Rs. 12,000. Hence the borrower will have to pay to theBank Rs.12,000. The Bank will also be ready to share the risk if the value of 1000 PVU after one year becomes even lesser than Rs.10,000.

My PVU Model is always a brain storming exercise for me and I wish I may really

give it a practical working shape.
(iii) My comments are the same as given under (ii) above.

Mr. Ziaul Haq

(i) In the modern capitalist economic theory and practice, interest is the price paid for the use of loanable funds, as wage rate is the price of services rendered by labour, rent for land and profit for entrepreneurship. There is no such categorization of the prices of factors of production in the Holy Qur'an or the Sunnah of the Prophet (PBUH) as the capitalist theory and practice are a post-Qur'anic phenomenon. The Holy Qur'an and the Sunnah generally emphasize just exchange, just wage, just return, and just price so that the powerful cannot exploit the weak party in any economic transaction, But if we adopt the capitalist economic system and its free enterprise we must logically pay interest as a price of loanable money resources as we pay rent for land. Elimination of interest requires revolutionary changes in the economic system.

(ii) Devaluation of the currency affects the payment of loans taken before such devaluation because the real value of money in these cases fluctuates.
(iii) Inflation causes changes in the purchasing power of money; it affects borrowers and lenders in different ways.

Prof. Sayyid Tahir,
International Institute of Islamic Economics, Islamabad

Indexation can be considered with reference to many types of contracts. This enlarges the scope of analysis and discussion very much. Dr. Ariff has rightly observed that most flows "get adjusted automatically in inflationary / deflationary situations. In other words, any discussion on indexation would become manageable and lead to fruitful conclusions if it is focussed on

(i) stocks, such as, qard-e-hasan or
(ii) Fixed contracts involving flow variables, such as wage contracts. I shall restrict myself to the former. This would serve the very useful purpose of helping to settle the principle for time-spaced, money-money transactions (which are not channelled through the profit-loss-sharing mode). In this regard, I shall limit my observations to the following four points related to the Shariah permissibility of indexation of qard-e-hasan contracts:
    (i) The principle of A'dl;
    (ii) The principle of giving full measure;
    (iii) The principle of La Darar wa La Dirar; and
    (iv) Fulfilment of contracts.

The arguments in favour of qard-e-hasan on grounds of A'die do not fully come up to the principle-of (تفسیر القرآن بالقرآن). The last two Ayahs on the prohibition of riba read as follows:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (٢٧٨)فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَلا تُظْلَمُونَ(٢٧٨:٢-٢٧٩)

The addressees' of these Ayahs are primarily lenders. They are being restricted to رؤوس اموالکم and ordered"لاتظلمون." Their interests are safeguarded by the assurance of"لاتظلمون", as an equally emphatic guideline for the borrowers. The converse of A'dl in muamalat is ظلم. Here an operational definition of A'dl is provided asلا تَظْلِمُونَ and لا تُظْلَمُونَThis also brackets the meanings of "رؤوس اموالکم ". A correct interpretation of this Ayah requires us to refer to the Sunnah of the Prophet (Sallallaho alaihay wasallam).

The Prophet (Sallallaho alaihay wasallam) is on record not to have instituted price controls. In other words, increase in product prices (leading to a relative decline in the value of money, in whatever form) did take place in the time of the Prophet (Sallallaho aiaihay wasallam). This implies that when the aforementioned Ayahs on Riba were revealed and acted upon, circumstances of the time included, among other things, inflation. In these circumstances the lenders were restricted to "رؤوس اموالکم " which referred to the principal lent and not to the adjusted value at the time of repayment. Given that riba was such a wide spread social practice (like(خمر requiring repeated admonitions in the Qur'an, it is inconceivable that "رؤوس اموالکم " was interpreted in practice as the principal adjusted for inflation and went unreported in Hadith. Some observers may say that this point was automatically taken care of in practice because of the nature of money (i.e., metallic money) and did not require an explicit mention. This point shall be answered later. For now the conclusion is manifest: Lender's suffering on account of inflation may not be against the norm of A'dl; whereas compensation by the borrower to the lender (besides the principal borrowed) may be against A'dl.

Next let us take the principle of "giving full measure", Money also serves as a measure of value. Therefore, the following Ayahs may be invoked to support the notion of stability in the value of money as well as returning the "same (in real terms)" as that borrowed:

واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم ذلک خیر واحسن تاویلا۔(بنی اسرائیل:٣٥)

الا تطغوا فی المیزان۔ واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان۔(الرحمن:٨۔٩)

Again these and other similar Ayas can be bestinterpreted reference to the first three Ayats of Surah تطفیف

ویل للمطففین۔ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون۔ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون (المطففین:ا۔۳)

or all Ayat pertaining to اصحاب مدین .Focus in all these Ayat is on measures of weight and length. Extending the meaning of these Ayat to invoke some "musts" for money is inappropriate on the following ground. .

Money is a measure of value. But the value that it purports to measure, that is, price is a relative thing. It depends on supply and demand factors. In these circumstances, money cannot be called upon to act like measures of weights and lengths whose focuses are absolute notions such as kilograms and kilometres. Nor can it be treated as such. In conclusion, the idea of returning the "same (in real terms)" may not be directly justified on grounds of "giving full measure".

The applicability of the principles **La Darham wa La Dinar** and fulfilment of contracts to qard-e-hasan contracts is also based on shaky logic. From nowhere does it necessarily follow that the lender is entitled to any compensation from the borrower personally. From a third party, say, government? Again I have my doubts about it. Government is on the one hand called upon to perform many functions which are inflationary. And, at the same time, it is required to correct the problems not of its asking. In modern times when money supply is ***endogenous*** also, not the entire problem can be blamed on the Government. How to aportion the fault, would be yet another challenge.

I may conclude my observations on the Shariah position by noting that the source of much confusion in the indexation debate lies in misunderstanding the nature of fiat money. Somehow the impression one gets from the ongoing debate is that fiat money is not on an equal footing withنقود of the good old times, with metallic content. I may submit that circumstances of earlier time warranted money to have intrinsic value (in the form of some metallic content) to ensure its general acceptability. Today the same thing is assured by virtue of fiat money being a legal tender with a full-fledged enforcement mechanism at its back. It has both the supply and demand aspects like درہم and دینار of the early Islamic period. It performs all the same functions and is affected in the same manner though general commodity-price fluctuations as its predecessors. In conclusion, monetary transactions today must be treated according to the fiqhi principles forنقود

SOME OBSERVATIONS ON THE FIXVALU SCHEME 04-05-17

If the FIXVALU-typc schemes arc just to index the qard-e-hasan-type transactions, it will clash with the مفہوم of Ayat on the prohibition of riba, as mentioned above. If, however, depositors actually transfer to banks FIXVALUs or claims onFIXVALUs, banks do the same with their clients, and so on, these may be legitimate transactions. Their legitimacy might stem from the permissibility of normal trade transactions. But a point needs clarification here. FIXVALUs price will fluctuate not only because of what happens' to the price level in

other markets, but also due to demand for them on account of the new function ascribed to them. Now whereas compensation on account of general inflation may be called for via FIX VALUs, will a compensation associated with fluctuations in the (relative) price of FIX VALUs itself not be like riba? This point is raised on the assumption of a FIXVALU being a real commodity (of a basket of goods). If a FIXVALU is not to have a commodit-base, the entire FIXVALU schemes become all the more dubious for being a حیلہ to circumvent the problem of riba.

Question No. 6. What would be the alternatives in the context of present-day economic conditions to carry on domestic and foreign trade efficiently without availing of banking facilities based on interest?

سوال نمبر ٦: سود پر مبنی بینک کاری کی سہولتوں سے استفادہ کیے بغیر موجودہ اقتصادی حالات میں وہ کون سی متبادل تجاویز ہو سکتی ہیں جن پر ملکی اور غیر ملکی تجارت کو کامیابی سے چلایا جا سکتا ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

بینک تاجروں کی جو جائز خدمات انجام دیتے ہیں، ان کا معاوضہ تو شرعاً بھی لے سکتے ہیں۔ باقی رہیں تجارت کی کامیابی کی تجاویز تو اس بارے میں عرض یہ ہے کہ سودی بینک کاری کے نظام کو بحال رکھ کر متبادل تجارت بے اثر ثابت ہوں گی۔ کچھ تجاویز تو سوال نمبر ۲ کے جواب میں عرض کر دی گئی ہیں، اور جب حرام کا راستہ بند ہو جائے گا تو حلال کے راستے خود بخود سامنے آ جائیں گے۔ غیر ملکی تاجروں کو اگر ہم سود نہ دیں تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قیمتیں بڑھا دیں گے، عملاً کچھ زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

اس کی تشریح کے لیے سوال نمبر ۲، کا جواب ملاحظہ ہو۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھا جائے۔ "سود کی متبادل اساس" از شیخ محمود احمد۔

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

۱۔ مسلم عوام اپنی رقومات برائے حفاظت بینک کے سپرد کریں گے، ان رقومات کو بااجازت کھاتہ دار روز مرہ کے تجارتی کاموں میں لگایا جا سکے گا۔

۲۔ مسلم عوام جو شرکت اور مضاربت نہیں چاہتے اپنی رقومات بطور قرض حسن بھی بینک کو دے سکتے ہیں اور یہ مد، مد امانت سے زیادہ محفوظ تصور ہوتی ہے۔ اس مد سے بھی تاجروں کو امداد دی جا سکتی ہے۔

۳۔ بینکوں کو براہ راست شرکت اور مضاربت کی اجازت ہو گی اور وہ رقومات کو ان مدوں میں لگا کر سود کے مقابلے میں زیادہ شرح سے منافع دے سکتے ہیں۔

۴۔ موجودہ دور میں حکومتیں زیادہ تر قیاتی سکیمیں بناتی ہیں اور اس طرح ان کے بجٹ ہمیشہ خسارے کے بجٹ ہوتے ہیں، پھر بجٹ کا ایک بڑا حصہ غیر ترقیاتی اخراجات، اسراف کی مدات، غیر ضروری دوروں اور غیر ضروری تقریبات پر صرف ہوتا ہے، حکومت کو چاہیے کہ تاجروں کی برآمدات اور درآمدات کی مد میں شارٹ ٹرم ضروریات کے لیے ایک عظیم فنڈ ہر وقت تیار رکھے اور ان تاجروں کو قرض حسن کے طور پر امداد دے۔ خود تاجروں سے سالانہ کٹوتی کر کے یہ فنڈ قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر جو تاجر شارٹ ٹرم قرضوں کی مد میں پچاس لاکھ روپے سود دیتا ہے وہ خود اپنی سہولت کے لیے کسی فنڈ میں دو لاکھ چند بخوشی دے سکتا ہے۔ جس سے خواہ اس کو بھی شارٹ ٹرم امداد ملے گی۔

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

It is not possible to give a general answer to this question about alternative to banking facilities related to domestic and foreign trade based on interest. We have to discuss specific facilities in some details. Instead of attempting to do it here I prefer to refer to the letters of credit, letters of guarantee, and other bank facilities presently being used by some Islamic Banks after due approval of some Shariah advisory board or the Islamic Fiqh Academy of the OIC. The report of the Council of Islamic Ideology on Elimination of Interest from the Economy (of Pakistan) also offers appropriate alternatives.

Mr. Hassanuz Zaman

Financing of domestic and foreign trade calls for eliminating the interest element from inland bills and foreign bills. This mode of financing on Islamic Lines was proposed by the Council of Islamic Ideology in its Report in the following words:--

> "In regard to bill of exchange, the council recommends as follows: Since the bank accepts the responsibility of realising the amount due to the drawer from the drawee, it is permissible under the Shariah that the bank may realise a commission for rendering this service. This commission will be variable according to the amount of the bill, but not according to the period of payment. The drawer will have to enter .into two separate agreements with the banks, one pertaining to the appointment of the bank as his agent for the collection of the amount from the drawee on the due date and the other for receiving a loan in the amount equal to the value of bill.
>
> The bank's commission will be payable in advance and the loan will be free of interest. On collection of the bill the bank will adjust the loan account of the drawer. In case the bill is dishonoured, the drawer will be liable for payment of the loan amount to the Bank."

It will be seen from the above proposal that the transaction involves local bank and local/importer/exporter dealing with a bank in his own country. The Council's proposal suggests the solution for local traders dealing with banks within Pakistan. What the bank in importer's/exporter's country outside Pakistan would do is not our concern.

Dr. Ramzan Akhtar

The scholars of Islam have suggested a number of financial instruments to facilitate internal and external trade. The most preferred are based on the principles of profit-loss sharing, like Mudarba and Musharkah arrangements. The other less preferred are: Bai Muajjal, Ijara, Ijara wa iqtina and Bai-Salam. They are defined as below:

> Bai Muajjai (Cost plus trade financing): The bank enters into an agreement with his client to purchase merchandise for the client and then the bank sells them to the client on the basis cost plus agreed profit margin, repayable in instalments over a specified period.
>
> *Ijara* (Lease or hire): The bank acquiresmachinery/equipment/building etc. forhis clientand charges a certain rental for their use.
>
> *Ijara walqtina*·· (Hire-purchase): The bank finances the purchase of equipment and the client uses them under a contract. The contract provides that the client will pay the cost of the instrument and a share in the net rental value of the equipment which is proportional to the outstanding shares in the total investment.

Bai Salam: The bank enters into an agreement with the client for advance purchase of merchandise and makes the payment of the agreed amount at the time of agreement.

It is important to note that above-mentioned techniques arc less than desired because of their resemblance to the interest underlying. Therefore, minimum use of these techniques will be made in Islamic banking.

Prof. Dr. Kharofa

To apply Islamic teachings in general and Islamic transactions in particular. (Note: This Question needs a conference of Ulema and Economists (who have faith: in Islamic Economy, for at least one, week of discussions and lectures in order to produce a concrete plan to Muslim Governments).

Nawazish Ali Zaidi

Domestic and foreign trade will have to be dealt with through the banking system. If the domestic banking system is Islamized then the problem of domestic trade is solved. Incase of foreign trade, the problem at the domestic-end is also taken care of. At the foreign-endwhere branches of Pakistani banks are operating, a solution can also be found. Where foreign banks in other countries are involved, interest is charged by banks only where their funds are involved; otherwise they will only demand their handling charges. There is an alternative which can be availed. That is the foreign importer/exporter can be requested by his Pakistani· counterpart that the interest charges, if any, will be on account of foreign importer/exporter. This, however, will require adjustment in the price of the goods being exported or imported.

Mr. M.Arshad Javed

As already suggested under '2' above, the Banks will have to come out of their conventional shell of just being financial intermediaries. The Banks will have to become Trading Houses themselves. Why can't the Banks perform the trading function of sale or purchase for and on behalf of their customers?

Mr. ZiazllHaq

No comments.

Question No.7. Is interest permissible or otherwise on the transactions between two Muslim States or a Muslim and non-Mustim State?

سوال نمبر ۷: کیا اسلامی احکام کے مطابق دو مسلم ریاستوں یا ایک مسلم اور غیر مسلم ریاست کے مابین سود کی بنیاد پر کاروبار جائز ہے یا ناجائز ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

(الف)۔ ناجائز ہے۔ جو چیز انفرادی اور نجی زندگی میں ناجائز ہو وہ اجتماعی زندگی میں بھی ناجائز ہوتی ہے۔ ریاستیں عوام کے لیے کاروبار کرتی ہیں اور عوام کی نمائندہ اور وکیل ہوتی ہیں اور جو چیز موکل کے لیے جائز نہ ہو وہ اس کے وکیل کے لیے بھی جائز نہیں ہوسکتی۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ھدایہ" میں ہے کہ

"کل عقد جاز ان یعقدہ الانسان جاز ان یوکل بہ غیرہ" (ھدایہ فی اول کتاب الوکالہ)

ہر وہ معاملہ جو ایک شخص خود کر سکتا ہو تو اس کے لیے وکیل بھی مقرر کر سکتا ہے

و من شرط الوکالۃ ان یکون الموکل مم یملک التصرف

(ہدایہ مع فتح القدیر ۷/۵۱۰، طبع ۱۹۷۰ء)

وکالت کی ایک شرط یہ ہے کہ مؤکل جس کام کے لیے وکیل مقرر کرتا ہے وہ اس کے لیے بھی جائز ہو۔

(ب)۔ قرآن و سنت میں ربا کو مطلقاً حرام کیا گیا ہے اور سود کا بقایا چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان نصوص میں ریاستوں کی استثناء نہیں ہے بلکہ اسلامی ریاست کا خود کسی سودی کاروبار میں ملوث ہو جانا تو زیادہ نقصان دہ ہے اس لیے کہ اس کا فرض منصبی سود کا مٹانا ہے اور غیر سودی معیشت کو نافذ کرنا ہے، تو جب یہ خود سودی کاروبار کرتی ہو تو معاشرے کو اس ظلم سے کس طرح پاک کر سکے گی۔

مسلمان اور کافر کے درمیان دار الحرب میں سودی کاروبار کا مسئلہ

(ج)۔ کچھ لوگ غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ سودی کاروبار کے جواز کے ثبوت میں امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد امام محمد کے اس مسلک کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ دار الحرب میں مسلمان اور کافر کے درمیان سودی لین دین جائز ہے اگرچہ اس سوال کے ساتھ براہ راست اس مسئلے کا تعلق نہیں ہے اس لیے کہ مسلم ریاست اور غیر مسلم ریاست کے درمیان سود کے جواز کا قول نہ امام ابو حنیفہؒ کا ہے اور نہ کسی اور کا لہٰذا اس مسئلے میں امام اعظم کے فتوے کو ثبوت میں پیش کرنا لاعلمی اور غلط فہمی پر مبنی ہے یا پھر فریب دہی پر مبنی ہے، لیکن چونکہ کچھ لوگ اس فتوے کو بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں اس لیے اس مسئلے کی بھی بقدر ضرورت وضاحت مناسب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے ایک شاگرد امام محمد جن کی رائے یہ ہے کہ دار الحرب کی حدود کے اندر حربی کافر اور اسلامی ریاست سے دار الحرب میں امن لے کر (ویزا) جانے والے مسلمان کے درمیان اور دوسرے عقود فاسدہ جائز ہیں لیکن اگر حربی کافر امن لے کر دار السلام میں آجائے تو پھر اس کے ساتھ دار السلام کی حدود کے اندر سودی کاروبار جائز نہیں ہے۔

(ھدایہ مع فتح القدیر باب الربا، ۷/۳۸۔۳۹، المبسوط للسرخسی ۱۰/۹۵، طبع ۱۹۷۸، بدائع الصنائع للکاشانی ۵/۱۹۲، طبع ۱۹۷۴ بیروت در مختار مع رد المحتار باب الربا ۴/۴۶۰، ۴۶۱)

دوسری جانب امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے شاگرد امام ابو یوسف اور جمہور فقہاء و محدثین کی رائے یہ ہے کہ ربا، قمار اور دوسرے عقود فاسدہ مسلمان کے لیے مطلقاً حرام ہیں۔ حربی اور غیر حربی میں اور دارالسلام اور دارالحرب میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے (فتح القدیر ج ۷، ص ۳۸ اور دوسری کتب)

امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے دلائل

امام ابو حنیفہ اور امام محمد کی تحقیق اور فتوے کے لیے جو دلائل السیر الکبیر للامام محمد اور دوسری کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ اور ان پر تبصرہ درج ذیل ہے:

(۱)۔ پہلی اور مشہور دلیل ایک مرسل حدیث ہے علامہ جمال الدین زیلعی حنفی (متوفی ۷۶۲ھ) نے اس حدیث کو اس تبصرے کے ساتھ نقل کیا ہے۔

"لا ربابین المسلم و الحربی فی دار الحرب قلت غریب و اسند البیہقیؒ فی المعرفۃ فی کتاب السیر عن الشافعی قال ابو یوسف انما قال ابوحنیفۃ ھذا لان بعض المشیخۃ حدثنا عن مکحول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہ قال لا ربا بین اھل الحرب و اظنہ قال و اھل الاسلام قال اشافعی و ھذا لیس بثابت ولا حجۃ فیہ انتہی کلامہ (نصب الرایہ للزیلعی ج۴۔ ص ۴۴۔ مجلس علمی ذھابیل ۱۹۳۸ء) (و مثلہ فی الدرایہ لابن حجر)

"مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے" یہ حدیث غریب ہے۔

(اس کی دوسری سند موجود نہیں ہے)۔ بیہقی نے اپنی کتاب "المعرفۃ فی السنن والآثار" میں سند کے ساتھ امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسف نے (جو جواز کے قائل نہیں ہیں) کہا تھا کہ ابو حنیفہ نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ بعض اساتذہ نے مکحول سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اہل حرب اور اہل اسلام کے درمیان سود نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور یہ حجت نہیں بن سکتی۔

زیلعی حنفی ہیں اور نصب الرایہ میں وہ حنفی مسلک کے دلائل نقل کرتے رہتے ہیں اگر یہ حدیث کسی اور سند کے ساتھ کسی کتاب میں موجود ہوتی تو زیلعی اس کا ذکر ضرور کرتے یا اگر ان کے نزدیک امام شافعی کی جرح درست نہ ہوتی تو اس کی تردید فرماتے۔

اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرنے والے مکحول الشامی الدمشقی (متوفی ۱۱۶ھ) ہیں

العجلی متوفی 261ھ ابن حبان متوفی 354، دار قطنی متوفی 385ھ اور ابن حجر عسقلانی نے مکحول شامی کو ثقہ قرار دیا ہے مگر یہ تابعی تھے۔ صحابی نہیں تھے (تاریخ الثقات للعجلی طبعی بیروت 1984ء ص 439 کتاب الثقات لابن حبان ج 5، ص 446 اسماء التابعین للدار قطنی طبع بیروت 1985ء ج 2، ص 256، التہذیب لابن حجر ج 10 ص 289 تا 292)

تابعی کی روایت میں جب صحابی کا ذکر نہ ہوا ہو تو اس کو حدیث مرسل کہا جاتا ہے۔ ثقہ تابعی کی مرسل روایت اگرچہ حنفیہؒ اور بہت سے دوسرے آئمہ کے نزدیک حجت ہے اور قابل قبول ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ سند میں ارسال کے علاوہ دوسری کوئی کمزوری موجود نہ ہو اور اس حدیث کی سند میں دوسری بڑی علت یہ ہے کہ مکحول سے نقل کرنے والا راوی مجہول ہے، امام ابو یوسف نے بعض المشیخ یعنی بعض اساتذہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور مجہول الاسم یا مجہول الحال راوی کی روایت حجت نہیں بن سکتی اگر یہ حدیث ابو یوسف کے نزدیک صحیح ہوتی تو اس کے مطابق فتوی دیتے اس لیے کہ یہ خود اس کے راوی ہیں مگر انہوں نے بعض المشیخۃ کا لفظ استعمال کر کے خود ہی اس کے ضعف کی جانب اشارہ فرما دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس درجے کی کمزور اور مرسل روایت قرآن و سنت ثابتۃ کے مقابلے میں کس طرح حجت بنائی جا سکتی ہے جب کہ قرآن کریم میں ربا کی حرمت کا حکم عام ہے اور قطعی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کو تلقی بالقبول حاصل ہے یعنی سلف اور مجتہدین نے اسے قبول کیا ہے اور دلیل بنایا ہے اور جس حدیث کو مجتہدین نے قبول کر لیا ہو وہ باوجود ضعف سند کے قابل قبول ہوتی ہے اس لیے کہ مجتہدین سلف کا قبول کرنا اور دلیل قرار دینا اس بات کا قرینہ ہوتا ہے کہ حدیث کی کوئی صحیح سند ان کو معلوم ہو گی جو ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ لیکن اس حدیث کو تو مجتہدین سلف کی غالب ترین اکثریت نے رد کر دیا ہے اور اسے مجتہدین میں قبول عام حاصل نہیں ہوا تا کہ اس قبول عام کو صحیح ہونے کا قرینہ قرار دیا جائے۔

2:۔ دوسری دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ "جب رومیوں کو ایرانیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور قرآن کریم نے پیشین گوئی کی کہ رومی چند سالوں (ببضع سنین) میں دوبارہ غالب آجائیں گے تو ابی بن خلف نے اس کا مذاق اڑایا اس پر ابو بکر صدیق نے شرط لگا دی کہ اگر رومی 9 سال کے اندر اندر دوبارہ غالب نہ آئے تو میں تم کو 100 اونٹ دوں گا اور اگر غالب آگئے تو تم مجھے 100 اونٹ دو گے۔ یہ معاملہ صاف جوا تھا۔ جب غزوہ بدر کے سال رومی غالب آگئے تو ابو بکر نے ابی بن خلف کے وارثوں سے (وہ خود مر گیا تھا) شرط کے مطابق اونٹ حاصل کیے۔ (سنن ترمذی کتاب التفسیر سورۃ روم۔ تفسیر ابن جریر سورۃ روم) اس روایت سے استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ چونکہ مکہ اس وقت دار الحرب تھا اور دار الحرب میں مسلمان اور کافر کے درمیان سود اور جواء جائز ہے اس لیے رسول اللہ نے نہ شرط باندھنے سے روکا اور نہ جوئے میں جیتے ہوئے یہ اونٹ واپس دلوائے، لیکن یہ استدلال اس لیے درست نہیں ہے کہ ترمذی ہی کی ایک اور روایت میں راوی نے تصریح کر دی ہے کہ یہ واقعہ جوئے کے حرام قرار دینے سے پہلے کا ہے۔ (ترمذی حوالہ مذکور)

سود اور جوئے کی حرمت کا حکم بعد میں نازل ہوا تھا اور یہ واقعہ اس حکم کے نزول سے بہت پہلے کا ہے شرط تو باندھی گئی تھی ہجرت سے پہلے اور اونٹ جنگ بدر کے سال 2ھ میں یا اس سے بھی بعد وصول کیے گئے اور اس وقت تک یقینا جوئے کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ براء بن عازب کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے ابو بکر سے فرمایا:۔

"تصلق بہ وفی روایۃ ھذا سحت تصلق بہ"۔ یہ ایک مکروہ مال ہے اسے صدقہ کردو) (تفسیر در منثور از سیوطی طبع 1983 ج6 ص479۔480۔ روح المعانی/ تفسیر قرطبیؒ سورۃ روم)

اگرچہ اس وقت جو احلال تھا لیکن پھر بھی یہ ایک مکروہ اور خلاف مروت چیز ہے کہ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا صدقہ کردو۔

3:۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب اسلام لانے کے باوجود مکہ مکرمہ مں مقیم تھے اور لوگوں کو سودی قرضے دیا کرتے تھے۔ مکہ چونکہ اس وقت دار الحرب تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سودی کاروبار سے منع نہیں کیا تھا اگر دار الحرب میں بھی کافروں کے ساتھ سودی کاروبار منع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ضرور منع فرمادیتے اس لیے کہ یہ تو مسلمان ہوگئے تھے۔ اس سلسلے میں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ابن عبدالبر نے "الاستیعاب میں" ابن الثیر جزری نے "اسد الغابہ" میں اور ابن حجر نے "الاصابہ" میں ایک روایت تو یہ لکھی ہے کہ حضرت عباس در اصل ہجرت سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور ہجرت کرنا چاہتے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغام بھیجا کہ تمہارا مکہ ہی میں رہنا مسلمانوں کے لیے مفید ہے چنانچہ وہ مکہ سے مسلمانوں کو حالات اور خبریں بھیجا کرتے تھے اور اپنے اسلام کو انہوں نے کفار مکہ سے چھپائے رکھا غزوہ بدر میں کفار مکہ ان کو زبردستی ساتھ لے گئے۔ قید ہونے پر اپ نے اپنا اور اپنے بھتیجے عقیل کا فدیہ ادا کیا اور واپس مکہ تشریف لے پھر فتح مکہ سے تھوڑی مدت قبل انہوں نے ہجرت فرمادی اور فتح مکہ میں شریک ہوئے۔ دوسری روایت یہ نقل ہوئی ہے کہ حضرت عباس فتح خیبر (7ھ) سے کچھ دیر قبل مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن حضرت عباس کا سودی کاروبار حرمت کے قطعی حتمی اور آخری حکم آنے سے پہلے تھا حتمی حکم آجانے پر حجۃ الوداع میں (اور اس سے قبل فتح مکہ کے موقع پر بھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ: ربا الجاھلیۃ موضوع واول ربا اضع چیک ربا العباس فانہ موضع کلہ
صحیح مسلم فی حدیث طویل کتاب الحج باب حجۃ النبی)

(جاہلیت کا سود ساقط ہوگیا ہے اور پہلا سود جسے میں ساقط کرتا ہوں ہمارے خاندان کا سود ہے یعنی عباس کا سود یہ بھی سارا ختم کردیا ہے۔)

بخاری کے حوالے سے اس سے پہلے سوال نمبر 1 کے جواب میں ابن عباس کی روایت نقل کردی گئی ہے کہ آخری آیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ سود کی حرمت کی آیت تھی یعنی حتمی اور کلی حرمت کی آیت ہے۔

4:۔ چوتھی دلیل یہ بیان ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب بنو نضیر کی جلاوطنی کا فیصلہ تو ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا ہمارے کچھ قرضے یہاں کے بعض لوگوں پر بقایا ہیں جن کی میعاد ابھی پوری نہیں ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ضعوا و تعجلوا ۔ کچھ کم کردو اور باقی میعاد سے

پہلے لے لو۔ (مستدرک حاکم: ج2، ص52 سنن کبری بیہقی: ج2 ص27، مجمع لازوائد: ج4 ص130 طبع 1967ء)

اس روایت پر استدلال یوں کیا گیا ہے کہ بنو نضیر کا علاقہ عملا دار الحرب تھا اور دار الحرم میں مسلمان اور کافر کے ک درمیان چونکہ سود جائز ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قرضے کی مقدار 100 کے بدلے میں 80 دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ مدت میں اضافے کی وجہ سے 80 کے بدلے میں 100 لینا بشرطیکہ احساناً کمی بیشی نہ کی گئی ہو بلکہ شرط اور معاہدے کی بنا پر ایسا کیا گیا ہو اور بنو نضیر کو تو باقاعدہ معاہدے کی دعوت دی گئی تھی اگر دار الرحب میں ربا جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس معاہدے کی پیشکش نہ فرماتے۔ لیکن درج ذیل وجوہات کی بنا پر دار الحرب میں جواز ربا کے لیے اس روایت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا:

(الف)۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بنو نضیر اصل میں تو اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری تھے اور معاہدہ مدینہ کی وجہ سے مدینہ کی ریاست میں رہتے تھے۔ انہوں نے عہد شکنی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا جو وحی آجانے کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا آخر کار یہ لوگ مصالحت پر مجبور کر دیے گئے اور جلا وطن کر دیے گئے۔ ان کا تو سارا مال مال فیئ تھا اس لیے کہ محاصرہ کے نتیجے میں ملا تھا اگرچہ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ان پر یہ احسان فرمایا تھا کہ اپنے قرضوں میں کمی کر کے باقی لے لو اور اسلحہ کے علاوہ جو چیز بھی ساتھ لے جا سکتے ہو لے جاؤ اس واقع کو دار الحرب میں جواز ربا کی دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ محاصرے اور ضیر سے پہلے یہ علاوہ دار الحرب تھا حالانکہ یہ بات بالکل صحیح نہیں ہے یہ علاقہ اسلامی ریاست کی حدود میں شامل تھا اور یہود غیر مسلم شہریوں کی حیثیت سے از روئے معاہدہ یہاں رہتے تھے تو فتح کے بعد تو یہ دار الاسلام کا حصہ بن گیا اور ضعوا تعجلوا کی پیشکش تو ظاہر ہے کہ صلح اور فتح کے بعد کی گئی تھی اس لحاظ سے تو پھر یہ روایت دار الاسلام کی حدود کے اندر بھی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سود کے جواز کی دلیل بن جاتی ہے حالانکہ یہ کسی کا بھی مسلک نہیں ہے۔

(ب)۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بنو نضیر کی جلا وطنی کا یہ واقعہ 4ھ کا ہے اور اس وقت سود حرام ہی نہیں ہوا تھا تو اس واقعہ کو دار الحرب میں جواز ربا کی دلیل کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

(ج) تیسری وجہ یہ ہے کہ مدت میں کمی کے بدلے میں قرض کی مقدار میں (ضع و تعجل کی صورت) کمی کرنا عین ربا نہیں ہے بلکہ شبہ ربوا ہے اور ذریعہ ربا ہے یعنی یہ حقیقی ربا کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کی حقیقی ربا کے ساتھ مشابہت ہے جمہور فقہاء تو اسے ناجائز کہتے ہیں بعض صحابہ سے بھی اس کے عدم جواز کے اقوال نقل ہوئے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے کہ یہ شکل بھی ناجائز ہے لیکن بعض علماء سے اس کا جواز بھی منقول ہے اس لیے یہ روایت دار الحرب میں (اگر بنو نضیر کے علاقے کو دار الحرب مان بھی لیا جائے) حقیقی ربا کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی۔

(د)۔ چوتھی اور آخری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کی سند پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں امام حاکم نے مستدرک میں اگرچہ اسے صحیح قرر دیا ہے مگر علامہ ذہبی نے فرمایا ہے کہ اس کا ایک راوی مسلم بن خالد زنجی ضعیف ہے اور دوسرا راوی عبدالعزیز بھی ثقہ نہیں ہے۔ (تعلیقات ذہبی بر مستدرک حاکم ج 2، ص 52)

ذہبی کے اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ زنجی بالاتفاق ضعیف نہیں ہے بعض محدثین نے اسے ثقہ بھی کہا ہے اور عبدالعزیز اگر غیر ثقہ بھی ہو مگر بیہقی کی سنن کبری ج 2، ص 27 پر اس کی موافقت اور تائید میں حکم بن موسی کی روایت بھی موجود ہے جو امام مسلم کی شرائط کے مطابق ثقہ ہے اسی طرح یحییٰ بن معین عجلی، ابو حاتم رازی اور ابن سعد نے بھی حکم بن موسی کو ثقہ قرار دیا ہے اس لیے یہ حدیث ہے۔ یہ ہیں وہ روایات جن کی بنیاد پر دار الحرب میں سود کو جائز قرار دیا جا رہا ہے لیکن ان روایات کا جو جائزہ ہم نے لیا ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جواز کی دلیل نہیں بن سکتیں اور یہ اتنی قوی اور واضح تو نہیں ہیں کہ ان کی بنیاد پر قرآن کریم کے عام حکم سے سے دار الحرب کو مستثنی قرار دیا

جائے حنفی مسلک تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے عام حکم اور مطلق حکم میں تخصیص و تقیید خبر واحد صحیح الاسناد کے ذریعے بھی جائز نہیں ہے اور یہاں تو خبر واحد صحیح الاسناد اور صریح الدلالہ بھی موجود نہیں ہے۔

5:۔ پانچویں دلیل یہ بیان کی گئی ہے اور اسی کو اصل دلیل قرار دیا گیا ہے کہ دار الحرب کے کفار کا مال مسلمانوں کے لیے مباح ہے اس لیے جس ذریعہ سے بھی یہ مال حاصل کر لیا جائے جائز ہے لیکن حربی کا مال بلکہ اس کی جان بھی حالت جنگ میں مباح ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو ان کے اموال مباح نہیں ہو سکتے یعنی جب مسلمانوں اور کافروں کے درمیان حالت جنگ قائم ہو بالفعل جنگ جاری ہو یا نہ ہو تو ایسی صورت میں اباحت مال کا حکم دیا جا سکتا ہے لیکن کیا جو لوگ امن کے ساتھ کفار کے ملک میں رہتے ہوں یا دار الاسلام مباح ہے؟ اس کے لیے قرآن و سنت سے کوئی دلیل ہونی چاہیے جو موجود نہیں ہے۔ قرآن و سنت سے اموال غنیمی اور اموال غنیمت کا جواز تو ثابت ہے مگر یہ حالت جنگ سے متعلق احکام ہیں یا بغیر جنگ کے صلح کی بنا پر یا کفار کے بھاگ جانے کی بنا پر جو اموال مسلمانوں کے قبضے میں آئے ہوں وہ مال فیئ ہوں گے۔ غنیمت اور فیئ بھی حکومت کے حوالے کیا جائے گا جسے وہ شریعت کے احکام کے مطابق تقسیم کرے گی اگر دار الحرب کے کفار کا مال مطلقاً مباح ہے خواہ حالت جنگ ہو یا نہ ہو تو پھر جواز کے قائلین نے یہ شرط کیوں لگائی ہے کہ یہ مال زبردستی نہ چھینا گیا ہو اور دھوکہ دے کر بھی نہ لیا گیا ہو۔ مال مباح کے حصول کے لیے تو مالک کی رضامندی شرط نہیں ہوتی غالباً انہی وجوہات کی بنا پر حنفی مسلک کے ممتاز فقیہ ابن الہمام نے بھی مسلک جواز کی دلیل میں اپنے شبہے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ حدیث یعنی لا ربا بین المسلم والحربی نصوص مطلقہ کے مقابلے میں اسی وقت پیش کی جا سکتی ہے جب کہ یہ صحیح اور قوی حدیث ہو۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ قابل استدلال ہے پھر بھی چونکہ یہ خبر واحد ہے اس لیے اس کے ذریعے قرآن کریم کے مطلق اور عام حکم میں تقیید و تخصیص حنفی اصول فقہ کی رو سے جائز نہیں ہے۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ حرمت کے احکام ان اموال سے متعلق ہیں جو مباح نہ ہوں اور حربیوں کا مال تو مباح ہے اس جواب کا تقاضی تو پھر یہ ہے کہ حربی کو سود دینا جائز نہ ہو صرف ان سے لینا جائز ہو اس لیے ان کا مال اگر ہمارے لیے مباح بھی ہو ہمارا مال تو ان کے لیے مباح نہیں ہے۔ ہمارے اساتذہ درسوں میں تو یہی کہتے ہیں کہ سود اور جوئے کا مال حربی کفار سے لینا جائز ہے مگر ان کو دینا جائز نہیں ہے مگر امام ابو حنیفہ کا مسلک تو مطلقاً نقل ہوا ہے کہ لینا اور دینا دونوں جائز ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ (فتح القدیر باب الربا: ج7، ص39)۔

ابن الہمام کے مذکورہ بیان سے صاف طور پر متشرح ہوتا ہے کہ ان کو دار الحرب میں جواز ربا کے دلائل پر پورا اطمینان حاصل نہیں ہے بالخصوص حربی کفار کو سود دینے کے جواز پر تو ابن الہمام بالکل مطمئن نہیں ہیں۔

ابن عابدین شامی نے بھی شرح السیر الکبیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس علت کی بنا پر دار الحرب میں ربا کے جائز ہونے کا فتوی دیا گیا ہے یعنی یہ کہ حربی کا مال مباح ہے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ حربی سے سود لینا تو جائز ہو مگر اسے سود دینا جائز نہ ہو (رد المحتار حاشیہ در مختار: ج4 ص 260-261)

علماء دیوبند جو حنفی مسلک رکھتے ہیں ان کے ممتاز علماء نے دار الحرب میں بھی سودی لین دین کو ناجائز کہا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو ترجیح دی جو جمہور فقہاء اسلام کا مسلک ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں:

کفار سے بھی سود لینا درست نہیں ہے۔ حضرت گنگوہی ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے تھے اور ان سے سوال بھی دار الحرب میں سود کے بارے میں ہوا تھا (فتاوی رشیدیہ ص ص 410، 413 طبع لاہور)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی حنفی ہونے کے باوجود امام ابو یوسف اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دی ہے اور دار الحرب میں ہر قسم کے سودی لین دین کو ناجائز قرار دیا ہے۔ (امداد الفتاوی: ج، 3، ص 155 تا 160 طبع کراچی 1397ھ)

دار العلوم دیوبند کے مفتی عزیز الرحمٰن کا فتوی بھی عدم جواز کا ہے اور اس رائے کو انہوں نے بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتی سے نقل کیا ہے (فتاوی دار العلوم دیوبند عزیز الفتاوی ج 6، ص 665۔666، باب السلم والربا طبع کراچی)

مفتی کفایت اللہ نے بھی دار الحرب میں سود دینے کو ناجائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ غیر مسلم حربی سے سود لینے کی اجازت دیتے ہیں (دار الحرب کی حدود کے اندر) (کفایت المفتی طبع ملتان: ج 8، ص 69، 71)

اگر کوئی حنفی عالم یہ سوال کرے کہ حنفی ہوتے ہوئے امام ابو یوسف کے قول کو کس طرح ترجیح دی جا سکتی ہے جب کہ امام ابو حنیفہ کا درجہ فقاہت میں ابو یوسف سے بلند ہے وہ استاد ہیں اور یہ شاگرد ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے کہ حرام علی من --- چیک۔۔۔ یعنی "حرام ہے اس شخص پر جو دلیل معلوم کیے بغیر میرے قول پر فتوی دیتا ہو۔ المیزان الکبری للشعرانی: ج 1، ص 58)

در مختار کے مقدمہ رسم المفتی میں ہے کہ اگر کسی مسئلے میں امام ابو حنیفہ اور اس کے شاگردوں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو جو شخص دلیل کی قوت کو سمجھ سکتا ہو وہ اس قول کو اختیار کرے جو دلیل کے اعتبار سے قوی ہو۔ (در مختار مع رد المحتار ج 1، ص 65۔66۔ بحوالہ الحاوی القدسی)

چونکہ امام ابو یوسف کی رائے دلیل کے لحاظ سے قوی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا حکم عام ہے اور قطعی ہے باقی آئمہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کی تائید میں صرف ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری کا قول طحاوی کی مشکل الآثار میں ملتا ہے باقی کسی کا قول نظر سے نہیں گذرا، اس لیے خود حنفی اصول کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جمہور کے مسلک کو ترجیح دی جائے۔

اگر امام ابو حنیفہ کا مسلک اختیار بھی کر لیا جائے تو پھر بھی اس کا اطلاق ان غیر مسلم ممالک پر نہیں ہوتا جن کے ساتھ مسلم ممالک کے معاہدے قائم ہیں اس لیے کہ ان کا مال تو مباح نہیں ہے معاہدین کا ملک اگرچہ اس لحاظ سے تو دار الحرب ہے کہ کسی بھی وقت وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے جنگ چھیڑ سکتے ہیں یعنی نظریاتی مخاصمت کسی بھی وقت عملی مخاصمت کی شکل اختیار کر سکتی ہے مگر جب تک معاہدہ قائم ہے اس وقت تک وہ مباح الاموال نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ اگر ان کا کوئی شخص دار الاسلام کے رہنے والے کسی شخص کے ہاتھ سے خطا قتل ہو گیا ہو تو اس کی دیت بھی دینی ہو گی (النساء آیت: 92) آج مسلمان ممالک اور غیر مسلم ممالک کے درمیان بین الاقوامی معاہدے قائم ہیں اس لیے امام صاحب کے فتوے کی رو سے بھی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کے باشندوں کے درمیان سودی لین دین جائز نہیں ہے۔ باقی رہیں ریاستیں تو مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کے درمیان سود کا لین دین تو کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف کے دلائل

امام شافعی، امام مالک امام احمد بن حنبل اور امام ابو یوسف کی دلیل ہے کہ قرآن کریم میں سود کے حرام ہونے کی آیتیں عام ہیں۔ حرم الربا۔ وذروا ما بقی من الربا اور لا تاکلوا الربا میں کسی تخصیص و استثناء کی دلیل موجود نہیں ہے مسلمان نے ہر جگہ اسلام کے احکام کی پابندی کرنے اور محرمات سے اجتناب کرنے کا عہد کیا ہے۔ اس کے علاوہ سود کی جو اخلاقی اور معاشی خرابیاں ہیں ان کا تعلق بھی کسی **مخصوص دار** اور ملک سے نہیں ہے بلکہ جہاں بھی سود خوری ہو گی وہاں یہ خرابیاں نمودار ہوں گی۔ خود غرضی، مادہ پرستی، سنگدلی اور بے رحمی وہ

اخلاقی بیماریاں ہیں جو سود خوری سے پیدا ہوتی ہیں اور معاشی عدم توازن اور دولت کا ارتکاز وہ اقتصادی خرابیاں ہیں جو سود کی خاصیات ہیں سود دارالاسلام میں ہو، دارالحرب میں ہو یا دارالصلح میں ہو اس سے کئی بیماریاں پیدا ہوں گی اس لیے اسلام نے اسے ہر جگہ اور ہر ملک میں حرام کیا ہے۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب۔

شریعت اسلام کے قانون عدل نے کفار اور غیر مسلم لوگوں کے ساتھ نہ تو ایسا چھوت چھات کا برتاؤ روا رکھا جیسا کہ ہندوؤں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جس کو تسلیم کرنا ایک معقول انسان کے لیے محال ہے اور نہ ایسا خلط ملط اور بے ضرورت اشتراکی معاملات کی اجازت دی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں اور کافروں میں کوئی تمیز باقی نہ رہے۔ چنانچہ انتہائی مجبوری کے حالات میں شریعت نے کفار کے ساتھ خرید وفروخت اور معاملات کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ کہ بوقت ضرورت ان کے ساتھ سودی لین دین بھی کیا جا سکتا ہے۔

لا باس بان یکون بین المسلم والذمی معاملہ اذا کان مما لابدمنہ

(عالمگیری: کتاب الکراھیۃ، ج5، ص359 (2) جواہر الفقہ: ج2، ص183)

(3)۔ معاشیات اسلام: عنوان، غیر مسلم ممالک سے صنعتی اور اقتصادی قرضے۔ 297)

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

جو احکام دو مسلمانوں کے درمیان ہیں وہی دو مسلمان ریاستوں کے درمیان نافذ ہوں گے، ایک مسلم اور ایک غیر مسلم ریاست کے درمیان معاملات باہم معاہدات اور بین الاقوامی قانون کے مطابق ہوں گے۔ لیکن کسی اسلامی حکومت کے شایان شان یہ امر نہیں ہے کہ وہ کسی حکومت کے ساتھ سودی معاہدے کرے۔ مکحول کی ایک مرسل روایت (لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب) جسے بیہقی نے نقل کیا ہے۔۔ لیکن اس کے بارے میں امام شافعی کہتے ہیں "لاحجۃ فیہ" اور صاحب عینی لکھتے ہیں ہذا حدیث غریب لیس لہ اصل سند وقال حافظ ابن حجر لم اجدۃ فی حاشیہ چلپی علی الھدایہ۔ ھذا حدیث مجھول لم یرد فی صحیح ولا مسند ولا کتاب موثوق بہ ۔

فتح القدیر میں ہے:۔ وھذا لا یفید لمعارضۃ اطلاق النصوص الا بعد ثبوت حجیتہ حدیث مکھول وقد یقال لو سلم حجیتہ فالزیادۃ بخبر الواحد لاتجوز فاثبات قید زائد علی المطلق من نحو لا تاکلوا الربوا ونحوہ وھو الزیادۃ لاتجوز۔امام ابو یوسف اور آئمہ ثلاثہ اس طرف گئے ہیں کہ جو شخص پاسپورٹ پر غیر مسلم ممالک میں جائے وہ وہاں لوگوں سے

سودی کاروبار نہیں کر سکتا۔ لیکن امام ابو حنیفہ اس طرح گئے ہیں کہ اگر باقاعدہ معاہدہ بالتراضی ہو تو جائز ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بحث سے ظاہر ہوا امام ابو حنیفہ کا مسلک ضعیف ہے۔

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

Interest is not permissible in transaction between two Muslim States or between a Muslim and non-Muslim State. Only necessity (darurah) can justify recourse to something not permissible, and interest is no exception. If a transaction must be made and there is no way to make it without using an interest based facility, it may be used till a permissible interest freeway to do it is found.

Mr. Hassanuz Zaman

The specious reasoning that gives rise to this and such doubts is that the Injunctions and prohibitions of the Qur'an are addressed to individuals and physical persons but not to **legal persons** and corporate bodies. In the case of Government the additional point that is adduced is that it stands for fulfilling the interest of its citizens not for exploitation. Thus if it borrows on interest it does so far the overall- benefit (maslaha) of people. This reasoning is not acceptable on the following grounds:

(1) As already pointed out above the Quranic prohibition is absolute and does not accept of any such exceptions.
(2) Particularly the adverse economic consequences of interest are much more disastrous in the case of inter-government borrowing than in the case of personal borrowings.
(3) The ultimate incidence of interest that is payable by a Government falls on the entire nation individually and collectively.

Dr. Ramzan Akhtar

Interest is not permissible on economic/financial transactions occurring between two Muslim countries. Muslim countries can eliminate interest from their economy provided they make sincere and serious efforts. What is needed is to muster the public

confidence. When this is achieved, the Islamic State can realize more tax revenue through extra taxes as well as through interest-free loans and voluntary contribution. Then, there may not be any need to raise interest-based loans.

However, in cases of extreme exigencies, a Muslim country can seek interest-based loans for as small amount and as shorter period, as possible.

The Islamic State provides for risks of poverty, sickness or any other calamity from the Bait-ul-Mal. Zakat-based social security and insurance administered by the State take care of the incidences of these natures.

Insurance business can be organized in the private sector on the basis of the principles of cooperation and mutual security. The important thing is to ensure that the elements of Riba and gambling do not enter into the functions of the insurance business. This can be done by forming mutual insurance companies where policy-holders contribute to the insurance funds by way of gifts. The insurance fund may be invested on the basis of Mudarbah and may also be available as Qarz-e-Hassan to the policy-holders. The payment to a policy-holder at the time of any calamity may be considered as a gift from the rest of the policy-holders. The profits earned on the insurance fund may be distributed on the basis of the relative contribution to the fund.

The above-mentioned insurance scheme may be Islamically accepted as it is purged of the elements of gambling and interest.

Prof. Dr. Kharofa

No, and absolutely not. Between two Muslim States the rules are very clear to me, i.e. interest is usury and there is no difference.

Between Muslim State and non-Muslim State, the answer also to me, is no. We cannot apply here the opinion of Abu Hanifa (R) which says that if a Muslim enters (Dar uI Harb), usury is legitimate for him, i.e. he can deal with those people by usury; we cannot apply it here because the contemporary non-Muslim countries are not: Darul Harb, since they are not fighting Muslims openly. Imam Malik says: even in this case, i.e. in the case of a Muslim who enters Darul Harb, Al-Riba is forbidden.

Nawazish Ali Zaidi

As the Our'an does not make any exception in respect of injunction on Riba, we must follow this in letter and spirit. In case where a non-Muslim State is involved, we may explain to them the alternative options available in a particular case.

Mr. M. Arshad Javed

So far as my little knowledge is concerned, I think, Interest transaction is absolutely NOT permissible between two Muslim States. Perhaps under extreme conditions, Muslim Fuqaha may allow Interest transaction between a Muslim and non-Muslim State and that too in a way that a Muslim State can pay Interest to a non-Muslim State but cannot receive Interest from a non-Muslim State.

Mr. Zialll Haq

No comments.

Question No.8. Is it possible to carry on insurance business otherwise than on the basis of interest?

سوال نمبر ۸: کیا بیمہ کا کاروبار سود کے بغیر چلایا جانا ممکن ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

ہاں جناب بالکل ممکن ہے مگر اس کو چلانے کے لیے بیمہ کمپنیوں کا موجودہ نظام ختم کرنا ضروری ہے۔ بیمہ کا سودی اور غیر سودی کاروبار اگر بیک وقت جاری رکھا جائے تو غیر سودی بیمہ کا نظام نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔

بیمہ کی متبادل غیر سودی صورتیں بیان کرنے سے پہلے موجودہ نظام کے بارے میں صحیح صورت حال کی وضاحت مناسب ہوگی اس لیے کہ بعض لوگ اسے بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

بیمہ کمپنیوں کا موجودہ نظام سود قمار پر مشتمل ہے۔

بیمہ کمپنیوں نے یہ بات بہت مشہور کردی ہے کہ بیمہ تو باہمی تعاون کا ایک نظام ہے۔ جس کا مقصد حوادث وآفات سماویہ سے متاثر ہونے والوں کی امداد کرنا اور ان کے نقصانات کی تلافی کرنا ہے۔ نظریاتی لحاظ سے تو بیمہ کا یہی مقصد ہونا چاہیے اور اغاز میں بیمہ اسی مقصد کے لیے کیا جاتا تھا لیکن حکم اور فیصلہ تصوراتی حقائق اور محض دعووں کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ حقائق واقعتاً اور عملا جو کچھ ہو رہا ہو اس کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنیوں کا مروجہ کاروبار سودی کاروبار ہی کی ایک شکل ہے جسے باہمی تعاون تکافل کا نام دیا جارہا ہے۔ فقہ اسلام کا قاعدہ ہے کہ: العبرۃ فی العقود للمقاصد والمعانی (المجلہ مادہ ۳، معین الحکام باب ۴۰)

عقود اور معاہدوں میں اعتبار اصل مقاصد کا ہوتا ہے صرف الفاظ کا نہیں ہوتا۔

مقصد ان کمپنیوں کا سود اور جوئے پر مشتمل ایک کاروبار کرکے نفع کمانا ہے۔ آفت زدہ لوگوں کے نقصان کی تلافی ان کا اصل مقصد نہیں ہے۔ باہمی تعاون تو تب ہوتا ہے کہ بیمہ داروں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا کہ ہم مشترکہ فنڈ سے ایک دوسرے کے نقصانات کی تلافی کریں گے لیکن عملا تو معاہدے بیمہ کمپنیوں اور بیمہ داروں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس معاہدے کی نوعیت کیا ہے، مصر کے ایک ماہر قانون ڈاکٹر عبدالرزاق سنھوری نے اس کی قانونی تعریف اس طرح کی ہے:

الامین عقد یلتزم المومن بمتقضاہ ان یؤدی الی المومن لہ او الی المستفید الذی اشترط التامین لصاحبہ مبلغا من المال او ایرادا مرتبا او ای عوض مالی فی حالتہ وقوع الحادث او لحقق الخطر المبین بالعقد و ذالک فی نظیر قسط او ایتہ دفعتہ ما لیسہ اخری یؤدیہا المومن لہ للموومن لہ للمومن (الوسیط فی الفقہ المدنی طبع بیروت ۱۹۶۴ء ج۷، ۲ ص ۱۰۸۴)

بیمہ ایک معاہدہ ہے جس میں تحفظ جس میں تحفظ دینے والا یہ پابندی قبول کرتا ہے (وعدہ کرتا ہے)

کہ وہ تحفظ حاصل کرنے والے کو (بیمہ دار کو) یا اس مستفید کو جس کے لیے بیمہ کرایا گیا ہے، رقم کی کوئی مقدار طے شدہ منافع یا کوئی دوسرا مالی معاوضہ کسی حادثے یا معاہدے میں بیان کردہ خطرے کے واقعہ ہو جانے کی حالت میں ادا کرے گا اور یہ ادائیگی ادا کردہ قسطوں یا کسی دوسری مالی ادائیگی کی نسبت سے کی جائے گی۔

مختلف ممالک میں بیمے کے قانون کی جزئیات میں فرق ہو سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ ایک مالی معاہدہ ہے جس کا ایک فریق بیمہ دار ہوتا ہے جو ایک متعین رقم قسطوں کی شکل میں (یا یکمشت) معین مدت کے لیے بیمہ کمپنیوں کو ادا کرتا ہے۔ اور دوسرا فریق کمپنی ہوتی ہے جو ان قسطوں کے بدلے میں اور ان کی نسبت سے کمپنی حادثے کی وجہ سے املاک کے نقصان کی تلافی کرتی ہے۔

زندگی کے بیمے، املاک کے بیمے اور ذمہ داریوں کے درمیان جزئیات میں فرق ہے لیکن ایک بات تینوں میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ ایک عقد مالی یعنی مالی لین دین ہے۔ کمپنی بیمہ داروں کی جمع کردہ رقم کو آگے سودی کاروبار میں لگاتی ہے اور سود کی اس رقم سے بیمہ داروں کو بھی حصہ دیتی ہے اور خود بھی لیتی ہے۔

اس عقد مالی میں قسطوں کی رقم اس رقم کے معاوضے اور بدلے میں دی جاتی ہے جس کا وجود بھی مجہول اور مشکوک و مشتبہ ہے اس لیے کہ یہ رقم اس وقت وجود میں آتی ہے جب کہ حادثہ رونما ہو جائے اور حادثے کا وجود صرف ایک احتمالی وجود ہے لہٰذا اس رقم کا وجود میں آنا بھی ایک احتمالی وجود ہے۔ حقیقی وجود نہیں ہے۔ اس رقم کا حاصل کرنا بھی مشکوک اور احتمالی ہے اس لیے کہ جس چیز کا وجود احتمالی اور مشکوک ہو اس کا حصول بھی احتمالی اور مشکوک ہوتا ہے۔ اور اس رقم کی مقدار بھی مجہول اور غیر معلوم ہے اس لیے کہ نقصان کا اندازہ تو حادثہ واقع ہو جانے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے اس قسم کے عقد مالی کو بیع غرر کہا جاتا ہے جو ممنوع ہے اس لیے کہ یہ دراصل جوئے کی ایک شکل ہے۔

عن ابی ہریرہ ان رسول اللہ نہی عن بیع الغرر

(صحیح مسلم فی البیوع باب بطلان بیع الحصاۃ)

(ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمادیا ہے)

بیع غرر کی بہترین تشریح امام مالک نے اس طرح کی ہے:

قال ابن وھب قال لی مالک تفسیر ما نھی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رضی اللہ عنہ من بیع الغرر ان یعمد الرجل الی الرجل قد ضلت راحلتہ او دابتہ او غلامہ و ثمن ھذہ الاشیاء خمسون دینارا فیقول انا اخذھا منک بعشرین دینارا فن وجدھا المبتاع ذھب من مال البائع ثلاثین دینارا وان لم یجدھا ذھب البائع منہ بعشرین دینارا وھما لایدریان کیف یکون حالہا فی ذالک واذا وجدت تلک الضالۃ کیف توجد وما حدث فیھا من امر اللہ مما یکون فیہ نقصھا او زیادتہا فھذا اعظم المخاطرۃ

(المدونۃ الکبری طبع سعادت ۱۳۳۳ھ ج۴، ص۲۰۶)

(ابن وہب کہتے ہیں کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا تھا کہ بیع غرر سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس کی تشریح اس مثال سے ہو جاتی ہے کہ ایک شخص دوسرے کے پاس جائے جس کا اونٹ یا کوئی دوسرا جانور یا غلام گم ہو گیا ہو ان چیزوں کی قیمت (مثلا) ۵۰ دینار ہے اس شخص نے یہ گم شدہ اونٹ ۲۰ دینار میں خرید لیا اگر خریدار کو وہ گم شدہ چیز مل جاتی ہے تو وہ اس صورت میں بیچنے والے کو ۳۰ دینار کا نقصان ہو گا اور اگر نہیں ملتی تو بائع کو ۲۰ دینار مفت میں مل گئے۔ بائع اور مشتری دونوں نہیں جانتے کہ گم شدہ چیز کا کیا حال ہو گا، ملے گی یا نہیں ملے گی، اگر مل بھی جائے تو پتہ نہیں کس حال میں ملے گی اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اللہ کے حکم سے اس میں کیا کمی بیشی ہوئی ہے یہ بہت بڑا مغالطہ ہے یعنی بازی لگانا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیمہ کمپنیوں کا مروجہ کاروبار قمار اور جوئے کا کاروبار ہے جو ممنوع ہے اس کے علاوہ اس میں ربا بھی شامل ہے اس لیے کہ اگر نقصان کی تلافی کی رقم بیمہ داروں کی قسطوں کی رقم سے زیادہ ہو اور بالعموم زیادہ ہی ہوتی ہے بلکہ کئی گنا زیادہ ہوتی ہے تو یہ اصل راس المال پر جو قسطوں کی شکل میں کمپنی کو دیا گیا تھا اضافہ ہے اور اسی کو ربا کہتے ہیں۔ سود کا یہ پہلو نفس عقد بیمہ میں موجود ہے ورنہ بیمہ داروں کی رقوم آگے جو سودی کاروبار میں لگائی جاتی ہیں اور اگر وقت مقررہ تک کوئی حادثہ رونما نہ ہوا یا زندگی کے بیمے کی صورت میں وقت مقرر تک بیمہ دار کی موت واقع نہ ہوئی تو قسطوں کی رقم بمعہ سود کے واپس کر دی جاتی ہے اس کا سود ہونا تو ہر ایک کو معلوم ہے لہٰذا سودی کاروبار ہونے کی وجہ سے بیمہ کمپنیوں کا موجودہ کاروبار ممنوع ہے۔

ایک اور وجہ اس کاروبار کے ناجائز ہونے کی یہ ہے کہ اگر بالفرض نقصان کی تلافی کی رقم قسطوں کی رقم کے برابر ہو یا اس سے کم ہو (اگرچہ یہ صورتیں نادر الوجود ہیں) تو یہ نقد کو نقد کے بدلے میں ادھار فروخت کرنا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "سونے کو سونے کے بدلے میں اور چاندی کو چاندی کے بدلے میں فروخت نہ کرو مگر اس صورت میں فروخت کر سکتے ہو کہ برابر برابر ہوں اور دست بدست ہوں۔ ایک وجہ اس معاملے کے عدم جواز کی یہ بھی ہے کہ قسطوں کی رقم کمپنی کے ذمہ قرض ہے اور نقصان کی تلافی کی احتمالی اور امکانی رقم بھی اس کے ذمے قرض یعنی واجب الادا ہے جب ان دونوں رقوم کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے تو یہ بیع الدین بالدین یعنی ادھار کا ادھار کے بدلے میں فروخت کرنا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عن ابن عمر قال نبی النبی عن بیع الکالئی اے بیع الدین بالدین۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی نے ادھار کا ادھار کے بدلے فروخت کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔

(مصنف عبدالرزاق: ج۹، ص۹۰ متوفی ۲۱۱ طبع بیروت ۱۹۷۲ء)

مصنف ابن ابی شیبہ: ج۶، ص۵۹۸، متوفی ۲۳۵ طبع کراچی)

(سنن کبری للبیہقی: ج۵، ص۲۹۰)

خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے موجودہ مروجہ کاروبار میں پانچ خرابیاں موجود ہیں ایک یہ کہ یہ بیع غرر ہے جو ممنوع ہے۔

دوسری یہ کہ اس میں قمار اور جوا ہے۔

تیسری یہ کہ اس کے نفس عقد میں بھی سود موجود ہے۔

چوتھی یہ کہ بیع الدین بالدین یعنی ادھار کے بدلے ادھار کا معاملہ ہے اور پانچویں یہ کہ بیمہ داروں کی رقوم سودی کاروبار میں لگائی جاتی ہیں۔

انہی وجوہات کی بنا پر مفتی کفایت اللہ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا مودودی نے بھی بیمہ کی موجود شکلوں کو ناجائز قرار دیا ہے (کفایت المفتی: ج۸، ص۷۶۔۷۷ طبع ملتان، امداد الفتاوی از مولانا تھانوی: ج۳ ص۱۶۰۔۱۶۱، رسائل مسائل از مولانا مودودی: ج۳، ص۳۱۳)

بیمہ کی جائز صورتیں

اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا حوادث کی آماجگاہ ہے اور ان حوادث و آفات کی وجہ سے جن لوگوں کے املاک تباہ ہوئے ہوں ان کے نقصانات کی تلافی ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ باہمی تعاون اور اجتماعی تکافل و تضامن اسلام کے معاشی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچھے سے اچھے مقاصد کے لیے بھی اگر غلط اور غیر شرعی طریقے اختیار کیے جائیں تو وہ خیر کی بجائے شر ثابت ہوتے ہیں۔ بیمہ کمپنیوں کے مروجہ سودی اور قماری نظام کی جگہ اگر درج ذیل طریقے اختیار کیے جائیں تو انشاء اللہ یہ معاشی انصاف اور اجتماعی تکافل کے لیے مفید ثابت ہوں گے اور یہ طریقے شرعاً جائز بھی ہیں:

(۱)۔ بیمہ کمپنیوں کو مشارکہ کمپنیوں میں تبدیل کر دیا جائے اور بیمہ داروں سے حاصل شدہ مشترک سرمائے کو نفع نقصان میں شراکت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت یا صنعت میں لگایا جائے اس اس سے جو منافع ہوتا ہو باہمی مشاورت اور رضامندی سے ان کا ایک حصہ اس مشارکہ کمپنی کے حصہ داروں کے نقصانات کی تلافی کے لی یا ان کے وارثوں کی کفالت کے لیے وقف کر دیا جائے اور باقی منافع حصہ داروں میں ان کے حصص کے تناسب تقسیم کر دیے جائیں یا ان کی حصص میں شامل کر دیے جائیں (حصہ داروں کی اجازت سے) اگر تجارت میں خسارہ ہو گیا تو اس خسارے کو منافع کے ریزرو حصے سے ہر گز پورا نہ کیا جائے اس لیے کہ وہ رقم تو وقف ہو چکی ہے بلکہ باقی سرمائے کے تناسب سے خسارے کو تقسیم کر دیا جائے اگر خدانخواستہ کمپنی دیوالیہ ہو گئی اور اس کا پورا سرمایہ ڈوب گیا تو اس کے لیے حکومت ہنگامی امداد کا انتظام کرے گی تاکہ کمپنی دوبارہ اپنا کام شروع کر سکے۔

(۲) یا بیمہ کمپنیوں کو مضاربہ کمپنیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے اس کی صورت بھی مشارکہ کمپنی کے درج بالا طریقہ کار کے مطابق ہو گی سوائے اس کے کہ خسارہ کمپنی پر نہیں ڈالا جائے گا اس لیے کہ اس صورت میں کمپنی مضارب یعنی صرف کاروبار کا نظام چلانے والی اور کام کرنے والی ہو گی سرمائے میں شریک نہیں ہو گی اور کام کرنے والے پر خسارے کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا البتہ کمپنی باہمی فیصلے کے مطابق منافع میں حصہ دار ہو گی۔ حوادث و آفات کی صورت میں مشارکہ اور مضاربہ دونوں صورتوں میں ریزرو فنڈ سے یعنی وقف سے نقصان کے تناسب سے امداد انہی لوگوں کو ملے گی جو معاہدے کی شرائط کے پابند ہوں اور کمپنی کے حصہ دار ہوں اس لیے کہ اسلام میں وقف عام بھی جائز ہے اور کمپنیاں جب ملک میں بڑے پیمانے پر چل پڑیں گی تو موجودہ سود و قمار پر مشتمل بیمہ سے بھی نجات مل جائے گی اور باہمی تکافل کا وسیع پیمانے پر ایک نظام بھی قائم ہو جائے گا۔

(۳)۔ صنعتی اور تجارتی اداروں کے مزدوروں کا بیمہ تو قمار اور ربا کے بغیر بڑی آسانی سے کرایا جا سکتا ہے کہ کچھ حصہ مزدوروں کی تنخواہ سے کاٹا جائے کچھ حصہ کارخانوں اور اداروں کی جانب سے ڈالا جائے اور کچھ حصہ حکومت اس میں شامل کرے اور اس فنڈ سے مزدوروں کو معذور

ہو جانے پر یا بڑھاپے کی وقت امداد دی جائے اور مزدور کے فوت ہو جانے کی صورت میں اس کے وارثوں کی مدد کی جائے۔ باقی رہے سرکاری ملازمین تو ان کے پراویڈنٹ فنڈ کا طریقہ اب بھی موجود ہے۔

(۴) ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم پیشہ لوگ اپنے پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل "امداد باہمی کی انجمنیں بنائیں" ان انجمنوں کے مشترکہ فنڈز ہوں جن میں انجمنوں کے ممبرز ماہانہ یا سالانہ کے حساب سے طے شدہ فیصلے کے مطابق عطیات داخل کریں۔ حکومت بھی ان فنڈز میں عطیہ جمع کرائے اور عام لوگوں سے بھی امداد کی اپیل کی جائے۔ اس فنڈ سے انجمن کے ممبران کے ان نقصانات کی تلافی کی جائے جو حوادث اور آفات سماویہ کی وجہ سے ہوئے ہوں۔ ممبران انجمن کے عطیات سے جمع شدہ سرمایہ وقف کی حیثیت سے محفوظ رکھا جائے گا۔ ممبران نے جو عطیے دیے ہوں وہ نقصان کی تلافی کی رقم کا معاوضہ اور بدل نہیں ہوں گے اس لیے نہ غرر ہوگا، نہ قمار ہوگا نہ ربا ہوگا اور نہ بیع الدین بالدین ہوگا کیونکہ یہ باہمی تعاون کے لیے ایک چندے اور عطیے کی حیثیت دیے جائیں گے اور واپس بھی نہیں کیے جائیں گے۔ یہ کوئی مالی کاروبار اور عقد مالی نہیں ہوگا یہ مضاربہ یا مشارکہ کمپنیاں نہیں ہوں گی۔ انجمن کے ممبران کا کاروبار الگ الگ ہوگا مگر ان کے عطیات و تبرعات سے ایک وقف فنڈ قائم ہو جائے گا جو وقف خاص کے اصول کے مطابق صرف انجمن کے ممبران کی امداد اور تلافی نقصان پر خرچ ہوگا۔

(۵) قتل خطا کی دیت کی ادائیگی اور مقتول کے وارثوں کی معاشی کفالت کے لیے "نظام معاقل" قائم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس نظام کو حکومت قانونا بھی قائم کرا سکتی ہے اور اسے قائم کرانا چاہیے ہم پیشہ افراد کی انجمنیں ایک مشترکہ فنڈ قائم کریں اور طے شدہ شرح کے مطابق اس میں ماہانہ یا سالانہ عطیات جمع کرائیں۔ انجمن کے ممبران کے ہاتھ سے اگر قتل خطا سرزد ہو جائے مثلا ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کسی کی موت واقع ہو جائے تو اس فنڈ سے مقتول کے قانونی یعنی شرعی وارثوں کو دیت کے شرعی احکام کے مطابق دیت ادا کی جائے گی۔

اگر قبیلوں اور برادریوں کا منظّم نظام موجود نہ ہو تو ہم پیشہ لوگوں کی انجمنیں اور "اہل دیوان" یعنی ایک محکمے سے تعلق رکھنے والے ملازمین کی انجمن "عاقلہ" یعنی دیت ادا کرنے والے قرار دی جا سکتی ہیں شریعت اس کی اجازت دیتی ہے مذکورہ ساری انجمنوں کے فنڈز وقف خاص ہوں گے مگر ممبران کے فیصلے کے مطابق ان کو تجارت میں بھی لگایا جا سکتا ہے جس کے منافع لازما ان فنڈز میں جمع کرانے ہوں گے شرکاء انجمن میں تقسیم نہیں کیے جا سکیں گے۔

(۶) مرکزی حکومت ملکی سطح پر بھی ایک فنڈ قائم کرے بجٹ میں اس کے لیے مناسب رقوم مختص کرے اور عام شہریوں سے اپیل کرے کہ وہ اس کار خیر میں حصہ لیں۔ اگر ملک میں بڑے پیمانے پر آفت اور تباہی آگئی ہو تو سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور زمینداروں (لینڈ لارڈز) سے مخصوص تناسب کے ساتھ جبرا اور قانونا بھی رقوم لی جا سکتی ہیں اس حکومتی اور قومی فنڈ سے بغیر کسی علاقائی اور پیشہ وارانہ تخصیص کے ریاست کے شہریوں کے ان نقصانات کی تلافی کی جائے گی جو حوادث و آفات کی زد میں آگئے ہوں۔

(۷) بیمہ کے مقاصد زکواۃ و عشر سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں زکواۃ کے آٹھ مصارف میں سے چھٹے نمبر پر غارمین کا ذکر ہوا ہے جو غارم کی جمع ہے۔ غارم کے لغوی اور حقیقی معنی ہیں من علیہ الدین یعنی وہ شخص جو مقروض ہو گیا ہو اور قرض کی ادائیگی کی استطاعت نہ رکھتا ہو لیکن جس شخص کا مال کسی حادثے کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہو اور اس پر لوگوں کے قرضے بقایا رہ گئے ہوں یا لوگوں کے قرضے تو اس پر نہ ہوں لیکن مال کی تباہی کی وجہ سے یہ اپنے گھر کے اخراجات کے لیے قرض لینے پر مجبور ہو گیا ہو تو اس کی زکوۃ و عشر کے فنڈ سے اتنی رقم دی جا سکتی ہے کہ جس سے

اس کے تباہ شدہ مال کے نقصان کی تلافی ہو جائے اور یہ اپنا روزگار دوبارہ بحال کر سکے عبداللہ بن عباس کے شاگرد خاص حضرت مجاہد بن جبر فرماتے ہیں:

ثلاثۃ من الغارمین رجل ذھب السیل بمالہ و رجل اصابہ حریق فذھب بمالہ و رجل لہ عیال فلیس لہ مال فھو یدان و ینفق علی عیالہ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ج3، ص207، طبع کراچی)

(تین قسم کے لوگ غارمین میں شامل ہیں ایک وہ شخص جس کے مال کو سیلاب بہا کر لے گیا ہو دوسرا وہ شخص جس کے مال کو آگ نے جلا دیا ہو اور تیسرا وہ شخص جو عیال دار ہو اور اس کے پاس مال نہ ہو تو وہ لوگوں سے قرض لے کر اپنے اہل خانہ پر خرچ کرتا ہے۔

سیلاب اور آگ وہ حوادث و آفات ہیں جن کی وجہ سے املاک تباہ ہوتی ہیں ایسے حوادث کے وقت نقصانات کی پوری یا جزئی تلافی زکواۃ فنڈ سے کی جا سکتی ہے مگر زکواۃ فنڈ سے نقصانات کی تلافی اسی وقت جائز ہو گی کہ آفت زدہ شخص کا سارا مال تباہ ہو گیا ہو حتی کہ وہ اپنے گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی قرض لینے پر مجبور ہو گیا ہو۔ ایسا شخص حکومت سے زکواۃ طلب بھی کر سکتا ہے جس کا مال حادثے کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہو۔ قبیصۃ بن مخارق کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ:

رجل اصابہ جائحتہ اجتاحت مالہ فحلت لہ المسلۃ حتی یصیب قواما من عیش او قال صدا دا من عیش۔

(نیل الاوطار باب الغارمین کتاب الزکواۃ: ج ۴، ص ۲۳۵، طبع لبنان ۱۹۳۸ء بحوالہ مسلم نسائی، ابو داود، احمد بن حنبل)

(جس شخص پر ایسی آفت آ پڑی ہو جس نے اس کا مال مکمل طور پر تباہ کر دیا ہو تو اس کے لیے زکوۃ سے تلافی کا مطالبہ کرنا حلال ہے (حدیث کے سیاق و سباق میں زکواۃ کا ذکر ہے) تاکہ وہ اپنی زندگی کی ضرورت پوری کر سکے یا یوں فرمایا تھا کہ اپنی معیشت کے نقصان اور خلل کی تلافی کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر زکواۃ و عشر کا نظام پوری طرح اور صحیح طور پر نافذ کر دیا جائے تو غارمین یعنی آفت زدہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی بڑی حد تک زکواۃ فنڈ سے بھی ہو سکتی ہے اور دوسری وہ چھ تدابیر جن کا میں نے ذکر کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ موجودہ بیمہ کمپنیوں کے سود خواری کے نظام کی ضرورت ہی نہیں۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

بیمہ کے کاروبار کو درست کرنے کے لیے اگر مندرجہ ذیل اصلاحات نافذ کی جائیں تو اس سے ملک میں انشورنس کی اصلاح چاہنے والوں کو بڑی رہنمائی ملے گی:

اولاً۔ حکومت کو اس امر پر راضی کرنا کہ کمپنی کا زر ضمانت اپنے کسی سرکاری یا نیم سرکاری صنعتی یا تجارتی کام میں حصہ داری کے اصول کے مطابق لگا دے۔ اور کمپنی کو اس کا ایک مناسب حصہ بطور منافع دیدے۔

ثانیاً۔ کمپنی کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا کہ وہ اپنے دوسرے سرمایہ کو بھی ایسے ہی منافع بخش کاموں میں صرف کرے جن میں سود کی بجائے متناسب منافع اس کو حاصل ہو۔ نیز کسی بھی سودی کاروبار میں اس کے سرمائے کا کوئی حصہ نہ لگایا جائے۔

ثالثاً۔ جب تک بیمہ کروانے والے یہ تسلیم نہ کریں کہ ان کی موت کی صورت میں جمع شدہ رقم ہی وارثوں کو دی جائے گی اور یہ کہ مذکورہ رقم شرعی قاعدے کے مطابق ورثا میں تقسیم ہوگی اس وقت تک ان کو انشور نہ کرائے (اس کے لیے اگر بیمہ کمپنی بیمہ کرانے والوں سے ایک حلف نامہ (Affidavit) اپنے پاس رکھیں تو اور بھی بہتر ہے۔

رابعاً۔ بیمہ کرانے والوں میں سے اگر کوئی اپنی رقوم پر منافع چاہتے ہوں تو ان کا روپیہ ان کی اجازت سے اس قسم کی تجارت میں حصہ داری کے اصول پر لگایا جاسکتا ہے۔ جس کا ذکر (۲) میں کیا جاچکا ہے۔

(۱)۔ معاشیات اسلام۔ ۴۱۱۔ (۲) الفقہ الاسلامی۔ (۴)۔ ۴۴۲۔ (۳)۔ اسبوع الفقہ الاسلامی۔ عقد التامین۔ استاد ابوزہرہ۔ ۴۶۷۔ ۴۲۷)

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

بیمہ کا کاروبار بغیر سود کے ممکن ہے۔ موجودہ دور میں کسی بینک کو کاروبار کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ صرف اسٹیٹ لائف کو کاروبار کرنے کی اجازت ہے۔ سٹیٹ لائف کے اعداد و شمار سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کو کاروبار، پلازوں اور تجارتی مدات سے کس قدر آمدن ہوتی ہے، اور محض سودی سرمایہ کاری کے ذریعہ سے کس قدر؟ اسلامی شریعت کے مطابق اور اسلامی نظریہ حیات کے مطابق سودی کاروبار "مقل" ہے اور حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے بھی ایسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا میں سود کے خلاف تحریک ہے۔

لیکن اگر کوئی کام بغیر سود کے ممکن ہی نہ ہو تو اسلامی ریاست اسے سرے سے ترک کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے شراب میں منافع بھی ہو سکتا ہے، اور سور کے گوشت میں غذائیت سے انکار کس کو ہو سکتا ہے اور یورپ میں جو فری سیکس اور بے پردگی ہے اس میں بھی کچھ نہ کچھ مفادات اور سہولتیں ہوں گی، سو فیصد مضر حرام تو دنیا میں صرف "زہر ہلاہل" ہی ہوتی ہے۔

پھر زکوۃ کی مد الغارمین کو ایک دائمی فنڈ کے ذریعے وسعت دی جاسکتی ہے بلکہ ہر محکمے اور ہر شعبہ حیات میں ایسے فنڈ قائم کیے جا سکتے ہیں جن میں اس شعبے کے لوگوں کے لیے سوشل سکیورٹی اور ہنگامی آفات کی صورت میں مدد کا انتظام ہو۔

Dr. Nejjat Ullah Siddiqui

It is possible to carry on insurance business otherwise than on the basis of interest. Interest enters insurance business by way of investing the revenue from the primium collected. Interest can be eliminated from insurance business by recourse to interest-free modes of investment. .

Mr. Hassanuz Zaman

Islamising insurance business is much easier than lslamising banking. Presently insurance on Islamic lines is being undertaken by a company in Malaysia and another in Sudan, Reinsurance is also being undertaken on Islamic lines. .

Prof. Dr. Kharofa

It could he as follows: The supposed Islamic Insurance company can take the cost of the policy of the insurance of every individual and do business with it basing on the rule of "Al-Madharabah" then subtract from the total of the profits, the payment of accidents (in case of car insurance) and then divide the residue (remnant) between the participants (shareholders), An example for this is: The Takaful company in Kuala Lumpur, Malaysia. This company is a successful one, and it is operating on the Islamic basis, to my knowledge.

Mr. Nawazish Ali Zaidi

If the economic system in Pakistan is Islamized then the question of interest in the domestic insurance transactions will not be involved.

The question whether 'Interest' is Islamic or not, is a matter which should he handled by experts in that field under the guidance of Ulema. I understand some work in this area is being done in relevant quarters.

Mr. M. Arshad Javed

No comments, People engaged in the insurance business may be invited to comment.

Mr. Ziaul Haq

It is not possible to carryon insurance business without interest-charges.

Question No.9. Does interest accruing on the Provident Fund comes under Riba(ربا)?

سوال نمبر۹۔پراویڈنٹ فنڈ اور سیونگ اکاؤنت پر جو نفع دیا جاتا ہے کیا وہ ربا کی تعریف میں آتا ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب۔

سیونگ اکاؤنٹس کا سسٹم تو عملاً سود ہی پر چل رہا ہے اگرچہ اس کا نام بدل دیا گیا ہے لیکن پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ پرائیویٹ کمپنیوں اور اداروں کے ملازمین کا پراویڈنٹ فنڈ میں نے سنا ہے کہ مزدوروں اور اداروں کے نمائندوں پر مشتمل کمیٹیوں کی تحویل میں ہوتا ہے۔ جو ملازمین اور اداروں کی نمائندہ (وکیل) ہوتی ہیں چونکہ وکیل کا قبضہ شرعا موکل کا قبضہ متصور ہوتا ہے اس لیے یہ فنڈ ملازمین کے قبضے اور ملکیت میں آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قبضے کے بعد گویا اپنے مملوکہ مال پر سود لینا ہے کس طرح حلال ہو سکتا ہے؟ لیکن سرکاری ملازمین کا جبری پراویڈنٹ فنڈ حکومت کے قبضے میں ہوتا ہے اور قانونا ملازم کو اس میں کسی قسم کے تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ حکومت کے قانون میں بھی یہ فنڈ ملازمین کی ملکیت نہیں سمجھا جاتا نہ اس پر ٹیکس لگتا ہے، نہ اس پر کسی اور قسم کے مالی فوائد حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ضرورت کے وقت کچھ شرائط کے ساتھ ملازمین اس فنڈ میں سے قرض لے سکتے ہیں، جو واپس فنڈ میں جمع کرانے ہوں گے یہ فنڈ دراصل ملازمین کی تنخواہوں کا بقایا حق ہے جو حکومت کے ذمہ واجب الادا ہے اور وہ اس حق کو طے شدہ شرائط کے مطابق ادا کرے گی لیکن جب تک اس پر ملازم کا قبضہ نہیں ہو جاتا، اس وقت تک یہ اس کی ملکیت میں نہیں آتا، صرف حق کی حیثیت سے حکومت کے ذمے بقایا ہوتا ہے حکومت ملازم کو ادائیگی کے وقت اس کی تنخواہ کے باقی حصے پر جو اضافی رقم دیتی ہے وہ ربا کی تعریف میں نہیں آتی۔ اس لیے کہ ربا تو قرض پر اضافے کو کہتے ہیں جب کہ بطور شرط و معاہدہ لیا جائے اور یہ رقم جب ملازمین کی ملکیت ہی میں نہیں آتی تو قرض دینے اور اس پر سود وصول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ ملازم نے قرض دیا ہے اور نہ اس پر اضافہ وصول کیا ہے۔ حکومت اگرچہ اسے سود کا نام دیتی ہے لیکن جس طرح کہ سود کو غیر سودی نام دے کر حلال نہیں کیا جا سکتا اسی طرح عطیے اور امداد کو سود کا نام دے کر حرام نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اضافی رقم دراصل حکومت کی طرف سے ایک عطیہ اور اعانت ہے جس کو سود کا نام دیا جا رہا ہے۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اسی سوال کی وجہ سے بعض بزرگوں نے اس اضافی رقم کو اعانت کے بجائے تنخواہ ہی کا ایک حصہ کہا تو سوال یہ ہے کہ عطیہ اور اعانت تو تبرع اور احسان ہوتا ہے جسے قانونا عدالت کے ذریعے جبراً وصول نہیں کیا جا سکتا لیکن ملازمین اس اضافی رقم کو بھی حکومت سے عدالت کے زور پر وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت جب کسی کے لیے اعانت کا اعلان اور اس کے

لیے قواعد و ضوابط بنادے تو اس پر وہ اعانت اور امداد واجب الادا ہو جاتی ہے البتہ عام شہری اگر کسی کے ساتھ امداد کا وعدہ کرلے تو اخلاقاً تو اس کا پورا کرنا ضروری ہے مگر عدالت اسے مجبور نہیں کرسکتی۔ اگرچہ امام مالک کے نزدیک عدالتیں عام شہریوں کو بھی ایفائے عہد پر مجبور کرسکتی ہیں الا یہ کہ وہ ایفائے عہد سے معذور ہوں مگر جمہور کا مسلک یہی ہے کہ عدالتیں مجبور نہیں کرسکتیں، اس لیے کہ یہ حقوق العباد نہیں ہیں بلکہ احسانات اور تبرعات ہیں اور عدالتوں کا کام حقوق دلوانا ہے۔

جن حضرات نے اس اضافی رقم کو تنخواہ کا حصہ قرار دیا ہے۔ ان کی بات میں بھی وزن ہے، اس لیے کہ جب ملازمت پر تقرری کے وقت یہ طے ہوتا ہے کہ اتنی رقم اصل تنخواہ سے کاٹی جائے گی اور مخصوص تناسب سے کچھ رقم حکومت بھی اس میں اپنی طرف سے جمع کرے گی تو گویا یہ اضافی رقم بھی تقرری کے وقت سے ملازم کی تنخواہ میں شامل ہوگئی ہے۔ فریقین کو اس کا علم بھی ہے اور دونوں اس پر راضی بھی ہیں جس طرح چیزوں کی قیمت معجّل بھی ہوسکتی ہے اور موجل بھی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح اجیر کی اجرت بھی معجّل اور موجل دونوں طرح طے کی جاسکتی تو گویا اصل تنخواہ سے کاٹی گئی رقم اور حکومت کی طرف اضافی رقم دونوں کا مجموعہ ملازم کی اجرت کا ایک حصہ ہے جو موجل ہے۔

کسی کے ذہن میں یہ سوال بھی آسکتا ہے کہ ملازم کے کھاتے میں جب اس کا پراویڈنٹ فنڈ لکھ دیا جاتا ہے تو گویا یہ اس کا قبضہ ہے لیکن ایسا نہیں ہے، قبضہ کے معنی ہیں تصرف کی آزادی اور کھاتے میں لکھنے سے ملازم کو اس فنڈ میں تصرف کا اختیار نہیں مل سکتا۔ کھاتے میں تو محض حسابات درست رکھنے کے لیے لکھی جاتی ہے تاکہ ادائیگی کے وقت حساب فہمی میں آسانی ہو اور ملازم کا استعمال یقینی ہو جائے۔

ایک اور سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ حکومت اس فنڈ کو سودی کاروبار میں لگاتی ہے لیکن اس لحاظ سے تو تمام اشیاء میں بالواسطہ طور پر سود موجود ہے۔ بالواسطہ سود میں تو پوری قوم گرفتار ہے، اسی لیے تو ہم اس سودی نظام کی اصلاح کے لیے کوشاں ہیں مگر ملازم نے براہ راست سود تو نہیں لیا۔ البتہ اگر ملازم نے درخواست دے کر اور کوشش کرکے اپنا پراویڈنٹ فنڈ بیمہ کمپنی یا کسی اور مستقل کمیٹی کو منتقل کردیا ہو تو یہ منتقل کرانے کا تصرف ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود وصول کرکے کمپنی یا کمیٹی کو دے دیا ہو۔ کمپنی یا کمیٹی چونکہ وکیل کی حیثیت رکھتی ہے اور وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ شمار ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اضافی رقم سود متصور ہوگی اس لیے کہ ملازم نے گویا قبضہ لینے کے بعد سود پر کمپنی یا کمیٹی کو دی ہے۔ باقی رہا مسئلہ اختیاری پراویڈنٹ فنڈ کا جو ملازم نے اپنی مرضی سے جبری فنڈ کے علاوہ کٹوائی ہو تو اس پر اضافی رقم لینا عین ربوا تو نہیں ہے اس لیے کہ کٹوانا حقیقی قبضہ نہیں ہے بلکہ حکماً قبضہ ہے کہ اگر یہ نہ کٹواتا تو وصول کرسکتا تھا۔ اس قبضہ حکمی کی وجہ سے اختیاری پراویڈنٹ پر اضافہ لینا شبہ ربوا اور ذریعہ ربا ہے۔ اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

مفتی کفایت اللہ اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی جبری پراویڈنٹ فنڈ پر دی جانے والی زائد رقم کو جائز قرار دیا ہے۔ (کفایت المفتی ۹۲/۸، امداد الفتاوی ۱۴۹/۳)

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

اس سوال میں سیونگ اکاؤنٹ پر ملنے والے سود اور پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، جہاں تک سیونگ اکاؤنٹ کا تعلق ہے، اس کی شرعی حیثیت اگلے سوال نمبر ۱۰ کے جواب میں آرہی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائی جائے۔ پراویڈنٹ فنڈ کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس سرہ مفتی اعظم پاکستان اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کی سرپرستی میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے جو علماء و مفتیان کرام پر مشتمل تھی، ایک تحریر مرتب کی تھی، جس کی تصدیق ہندو پاک کے نامور علماء و مفتی صاحبان نے کی ہے۔

یہ تحریر "پراویڈنٹ فنڈ" کے نام سے مطبوع شکل میں موجود ہے، جس سے اس مسئلہ کی شرعی حیثیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

اس کتابچہ میں پراویڈنٹ فنڈ لینے والے کے نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے، اور اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ورنہ جہاں تک پراویڈنٹ فنڈ جمع کر کے اسے سودی کاروبار میں لگانے کا تعلق ہے اس کی موجودہ صورت بہرحال حرام ہے، حکومت کو چاہیے کہ اس کے لیے مضاربت اور شرکت کی جائز صورتیں اختیار کرے۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب۔

علامہ ابن نجیم نے کہا ہے کہ جب تک اجرت پر اجیر کا قبضہ نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کی ملکیت نہیں کہلائی جاسکتی۔ صرف بطور حق اجیر اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ (البحر الرائق ۷/۳۲۷) بحر الرائق کے مذکورہ تصریح کے مطابق پراویڈنٹ فنڈ سرکاری ملازم کا حق تو ہوتا ہے لیکن اس کی ملکیت میں موجود نہیں ہوتا۔ اس بنا پر محکمہ کی طرف سے اس پر دیا جانے والا نفع محکمہ کا ایک طرفہ عمل ہے۔ اس لیے شرعی نقطہ نگاہ سے یہ ربا کی تعریف میں نہیں آتا۔ (امداد الفتاوی ۳/۱۲۳) اس کے برعکس سیونگ اکاؤنٹس پر آنے والا نفع اگر شراکت کی بنیاد پر نہ ہو سود کی تعریف میں آتا ہے۔

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

پراویڈنٹ فنڈ بھی ایک فرد کا سرمایہ ہوتا ہے، سیونگ اکاؤنٹ بھی ایک امانتی اکاؤنٹ ہوتا ہے اور ساہوکار جو پیسہ دیتا ہے وہ بھی ایک فرد کا سرمایہ ہوتا ہے جو کسی مجبوری سے قرض لیتا ہے اس کے زاویہ سے کیا فرق ہے کہ وہ یہ قرض کسی ساہوکار، یا یہودی یا سرکاری ملازم سے براہ راست لے یا بالواسطہ بینک لے۔ یہ فنڈ بینکوں کے پاس امانت کے کھاتوں قرض کے کھاتوں یا شراکتی کھاتوں، یا کمپنی کے حصص کی شکل میں رکھے جاسکتے ہیں اور اگر ان کا استعمال ضروری ہے تو اسے مضاربت اور شراکتی کھاتوں میں رکھا جائے۔ پراویڈنٹ فنڈ کا وہ حصہ جو کسی ملازم کو حکومت دیتی ہے وہ اس کی تنخواہ کا حصہ ہوتا ہے۔

Dr. Nejat Uiliah Siddiqui

Yes, interest accruing to the Provident Fund comes under riba. It is possible, however, so to invest the sum deducted from employees' salaries contributed by the employers that halal profits may accrue to the provident fund.

Mr. Hassanuz Zaman

So long as Provident Fund is compulsorily deducted by the employer, invested and retained by him without the employee's consent, his share in return fixed or calculated unilaterally, and is denied the owner's right to dispose it whenever he likes, the return paid on Provident Fund should not be treated as *riba*. All these situations are regulated by law and neither, the employer nor the employee has any say in the matter. In case the employee voluntarily offers the additional amount for deduction as P.F. the amount accruing as interest would come under Riba. However, if the Fund is invested on PLS basis the amount accruing in addition to investment would be termed as profit.

Interest on Savings Bank Account comes under *Riba*.

Dr. Ramzan Akhtar

The interest accruing on the saving bank account can be considered as Riba if the income earned by the proceeds of this account do not qualify profit-loss sharing conditions. For instance, if the return from the saving bank account is linked to the return of any single Government undertaking. The reason is that the proceeds of the saving account become a part of the Government budget. However, if the return from the saving banking account specifically earmarked are used in a specific undertaking and the account-holders share in the profit/loss of such undertaking, then the resulting income become Isiamically legitimate.

In the light of Islamic injunctions, the interest earned on the Provident Fund does not fall in the definition of Riba. The reason is that employer does not owe the amount of the fund, during the period in which the interest has been earned.[6] Therefore, the excess amount earned over the actual amount deposited cannot be considered Riba. Here, the Fuqaha make two suggestions: One is that the government department has added -the excess amount without the written approval of the employee. In this case, accumulating excess amount is riba-free. In the second case, the employee himself can ask the Government to treat his fund as interest-based, then the excess amount resembles to riba.

Prof. Dr. Kharofa

Absolutely

Nawazish All Zaidi

In my opinion, this whole issue is full of confusion. The question of Riba

will come in, if there is a loan transaction. It is to be seen if the employees are giving a loan to their employer?

The existing confusion can be removed and doubts put at rest, if small changes in the present system are made. For instance, instead of applying interest on employees' provident fund, the employers may change the rules. For example, it

[6]Shafi, Mufti Muhammad "Provident Fund Par Zakat Aur Sood Ka Mas'ala" Dar-ul-Ishaat, Karachi pp.18-20.

can be laid down that when an employee retires or resigns, the employer will give to the employee a sum equal to employees' contribution by way of a gift or perk. Employer's gift can be so worked out that no one is a loser.

Mr. M. Arshad Javed

Perhaps accruing anything on Provident Fund is not Interest because the Provident Fund is held by the employer and the employer may give any benefit to the employees. It is indeed very unfortunate that even benefits to the employees are allowed by way of Interest.

So far Interest on Savings Bank Account is concerned, it comes under 'Riba' as it is time related and the Account-holder always has an access to the amount held in his Account.

Mr. ZiaulHaq

Interest accruing on the Provident Fund or Saving Bank Account come under riba,

Question No. 10. Can the payment or prize money money on Prize Bond or Saving Bank Account or other similar schemes be regarded as Riba (ربا)?

سوال نمبر 10: کیاانعامی بانڈوں پر یا سیونگ اکاؤنٹ پر یا کسی اور سکیم پر دی جانے والی رقم ربا کی تعریف میں آتی ہے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب۔

سیونگ اکاؤنٹ کا نظام جو مروج ہے وہ تو سود پر مشتمل ہے، اور دوسری سکیم کی تشریح نہیں کی گئی، تاکہ جواب دیا جاسکے۔ باقی رہے انعامی بانڈز تو قمار اور جوا ہے، جسے انعامی بانڈز کا نام دے دیا گیا ہے۔ فقہ کا یہ قاعدہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ عقود میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے، صرف الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ۔

ان المخاطرة من القمار۔ (احکام القرآن للجصاص، جلد اول صفحہ ۳۸۸)

(بازی لگانا اور رقم کو داؤ پر لگانا جوا ہے)

انعامی بانڈوں اور معمہ بازیوں کا طریقہ مخاطرے میں شامل ہے، اس لیے جوا ہے اور حرام ہے۔

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب۔

سیونگ اکاؤنٹ پر بینک یا ڈاک خانے کی جانب سے "نفع" کے نام پر جو رقم اکاؤنٹ ہولڈروں میں تقسیم کی جاتی ہے وہ بلا شبہ ربا میں داخل ہے کیونکہ اکاؤنٹ ہولڈروں کی طرف سے جمع کروائی جانے والی رقم بینک کے ذمہ قرض ہوتی ہے اور بینک اصل راس المال پر جتنی زائد رقم دیتا ہے وہ ربا ہے۔

اکاؤنٹ ہولڈروں کی طرف سے دی جانے والی رقوم بنک کے ذمہ امانت اس لیے قرار نہیں دی جاسکتیں کہ امانت میں رقم کا بجنسہ محفوظ رہنا ضروری ہے نیز امانت کی رقم میں تصرف کرنے سے وہ امانت، امانت نہیں رہتی قرض میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بنک اپنے اکاؤنٹ ہولڈروں کی رقوم بجنسہ محفوظ نہیں رکھتا بلکہ اس میں ہر طرح کا تصرف کرتا ہے۔۔۔ (امانت کی صورت میں وہ "بنک لاکرز" ہیں جن میں لوگ اپنی قیمتی اشیاء محفوظ رکھتے ہیں، بنک ان میں ادنی تصرف نہیں کرتا بلکہ حفاظت کی اجرت وصول کرتا ہے جو شرعاً جائز ہے۔

"ربا" ہی کی ایک صورت وہ بانڈ یا بیریر سرٹیفیکیٹ ہیں جنہیں حکومت یا مختلف ادارے عوام سے رقوم حاصل کرنے کے لیے جاری کرتے ہیں، ان میں بھی بانڈز یا سرٹیفیکیٹ کے عوض عوام سے رقوم قرض لی جاتی ہیں اور مختلف مدتوں کے حساب سے مختلف شرح پر عوام کو ان قرضوں پر سود ادا کیا جاتا ہے، ان کے بھی "ربا" میں داخل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ جہاں تک انعامی بانڈز کا سوال ہے تو اس میں "ربا" کی مذکورہ بالا خرابی کے علاوہ "قمار" یعنی جوئے کی بھی خرابی ہے، اس حیثیت سے اس میں دوہرا گناہ ہے ایک سود کا اور دوسرے جوئے کا۔ کیونکہ انعامی بانڈ میں اولاً بانڈ کے عوض عوام سے رقوم قرض لی جاتی ہیں جن پر حکومت کی طرف سے عمومی طور پر مشروط نفع کا اعلان ہوتا ہے جو سود ہے مگر وہ نفع دوسرے بانڈز کی طرح تمام قرض خواہوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر یہ جوا کھیلا جاتا ہے کہ وہ سود جو سب میں مساوی تقسیم ہونا تھا، قرعہ اندازی کے ذریعہ چند آدمیوں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ان چند آدمیوں کے وارے نیارے ہو جاتے اور باقی محروم ہو کر اگلی مرتبہ پھر جوئے میں شرکت کا ارادہ کرتے ہیں (جو جوئے کا خاصہ ہے)۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب۔

انعامی بانڈز اور سیونگ اکاؤنٹ پر دی جانے والی رقم سود کے ضمن میں آتی ہے۔ این آئی ٹی یونٹس ان سے مستثنی ہیں۔ مزید اگر کسی اور سکیم پر کوئی رقم سوال نمبر ۳ کے جز (ب) کے تحت دی جائے تو پھر سود کی تعریف میں نہیں آتی۔

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

انعامی بانڈز اور اس قسم کی تمام بچت یا رفاعہ عامہ کی سکیمیں اگرچہ بظاہر خوش نما نظر آتی ہیں لیکن معاشی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے یہ مہلک تجویزیں ہیں:

1۔ ان میں قمار بازی کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے جو حرام ہے، بلکہ وہ ربا + قمار ہے۔

2۔ جو لوگ ان کاموں میں حصہ لیتے ہیں وہ محنت کے عادی نہیں رہتے وہ ہمیشہ محنت کے بغیر بیٹھے بٹھائے دولت جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور یہ وہی سود خوارانہ ذہنیت ہے، اور اگر انہیں کسی پر امن ذریعہ سے کچھ نہ ملے تو آخر وہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ جب کسی فرد کو معلوم ہوگا کہ لیس للانسان الا ما سعی (انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی وہ کوشش کرے گا) تو پھر ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت فراڈ، ڈاکے، سود، قمار اور چوری کے بارے میں نہ سوچے گا بلکہ وہ ہر وقت محنت مزدوری اور جائز طریقے سے حصول دولت کے لیے سعی کرے گا۔

سیونگ اکاؤنٹ کی رقم کو آخر مضاربت میں کیوں نہیں لگایا جاتا۔

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

Yes, the payment of prize money on prize bond or saving account or other similar schemes should be regarded as riba. It should also be noted that public savings can be mobilised through instruments based on sharing, in which case the above-mentioned schemes become redundant.

Mr. Hassanuz Zaman

Riba includes both interest as well as usury. Prize money or Prize bonds as in Pakistan or on Savings Account as in Iran or any similar schemes any where else is usury and thus comes under riba.

Dr. Ramzan Akhtar

The payment on prize money or prize bond resembles gambling (Qimar). The income earned through prize is generated without participating in any real economic activity. Therefore, the payment on prize money is illegitimate from Islamic point of view. The payment on the saving bank account is already discussed in Question No.9.

Prof Dr. Kharofa

It is, to me, illegal, "Haram", because it is based on a fixed percentage, moreover, the customer is not sharing the loss with the bank and most Muslim scholars say so. The only exception is Sh. Abd Alwahab Khallaf of Egypt; he said that a saving account is legitimate -- (More detail on this on page 279 of my dissertation: Aqd-Oardh) concerning the rest of this question: if the company is operating according to the Islamic 'rules "Al-Mudharaba" or other sort of Islamic companies, the dividends are legal "Halal", otherwise if the BOND was a result of illegal activity, no doubt that it will be seen as "Riba". .

Nawazish Ali Zaidi

Prize bonds are a method of borrowing funds by the Government. Interest at a certain rate is distributed among the holders through a draw. So long as money is being borrowed, whatever the form, any addition to principal sum comes under Riba.

Some people think that whatever return is fixed or predetermined is Riba and whatever is not fixed/predetermined is not Riba. In my view, this is not correct. Money earned through money-lending is Riba. Fixity and predetermination is an attribute of Riba and is not its substance.

Mr. M. Arshad Javed

Perhaps the Prize Money may not be regarded as 'Riba' but Riba only is not forbidden in Islam, Qimar and Gharar are also forbidden.

Mr. Ziaul Haq

Payment of Prize Money on Prize Bond or Saving Bank Account and other similar schemes come under Riba.

Question No. 11. Would it be lawful under Islamic Law to differentiate between business loans on which interest may be charged and the consumption loans which should be free of interest?

سوال نمبر 11:۔ کیا اسلامی قانون کے تحت تجارتی اور غیر تجارتی قرضوں میں امتیاز کرنا درست ہوگا، اس طرح کہ تجارتی قرضوں پر سود لیا جائے، اور غیر تجارتی قرضے بلا سود ہوں؟

مولانا گوہر رحمان صاحب۔

نہیں جناب کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہر قسم کے قرضوں پر سود دینا حرام ہے، دلائل درج ذیل ہیں۔

اس سوال کی کوئی قانونی اہمیت نہیں ہے کہ کیا عربوں میں نزول قرآن کے وقت تجارت کے لیے گئے قرضوں پر سود لیا جاتا تھا یا نہیں، اور کیا تجارت کے لیے لوگ قرض لیتے تھے یا نہیں؟ اصل اہمیت قانون کے متن کو حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کی کسی بھی عدالت کے سامنے جب ایسا تحریری قانون پیش کیا جائے جس کے متن کے الفاظ عام ہوں اور ان عام الفاظ کے بعد کوئی فقرہ شرطیہ، فقرہ استثنائیہ یا کوئی تشریحی فقرہ موجود نہ ہو اور مجموعہ قوانین میں کوئی دوسری دفعہ بھی اس عام قانون میں تخصیص واستثناء کرنے والی موجود نہ ہو تو عدالت اسے عام ہی قرار دے گی اور جس پر بھی یہ عام قانون صادق آتا ہو اس پر منطبق کرے گی اگر عدالت یا عدالت کے سامنے بحث کرنے والا کوئی وکیل بغیر کسی قانونی دلیل کے محض اپنی صوابدیدی رائے یا خواہش کی بناء پر اس عام اور واضح قانون میں تخصیص کرے گا تو یہ قانون کے بغیر نہیں ہوگی بلکہ نئی قانون سازی ہوگی یا بالفاظ دیگر قانون میں تحریف وترمیم ہوگی۔ میرے خیال میں یہ فلسفہ قانون کا ایسا نکتہ ہے جسے عقل عام تسلیم کرتی ہے اب آیئے اس مسلمہ قاعدے کی روشنی میں زیر بحث مسئلے پر غور وفکر کریں۔

عام کی تعریف

عموم کے معنے ہیں شمول اور لفظ عام کی فقہی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

هو اللفظ الذى يستغرق جميع ما يصلح لہ من الافراد (اصول سرخسی، ج۱، ص۱۲۵)

عام وہ لفظ ہے جو ان تمام افراد واقسام کو شامل ہو جو اس کے مفہوم میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یعنی جن پر عام کا مفہوم منطبق ہو سکتا ہو عربی زبان میں لفظ عام کی تقریباسات قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم ان الفاظ کی ہے جن کے حقیقی معنی میں عموم و شمول موجود ہو مثلا کل، جمیع، عامۃ، کافۃ، اور قاطبہ، وغیرہ اور دوسری قسم وہ لفظ مفرد ہے جس پر الف لام استغراقی داخل ہوا ہو۔ (اصول سرخسی: ج۱، ص۱۵۱)

عام کی اس تعریف کی روشنی میں حرمت ربا کی نصوص (متن قانون) پر غور کرنا چاہیے تاکہ قانون نافذ کرنے والے کی مراد متعین ہو سکے۔

احل الله البيع وحرم الربا (البقرہ: ۲۷۵)

اللہ نے بیع حلال کیا ہے اور ربا حرام کیا ہے۔

وذروا ما بقى من الربا۔ (البقرہ: ۲۷۸)

اور چھوڑ دو جو بھی باقی ہو ربا میں سے۔

فلكم رؤس اموالكم (البقرہ: ۲۷۹)

پس ملیں گے تم کو تمہارے اصل مال۔

پہلی دو آیتوں میں لفظ الربا مفرد ہے جس پر الف لام استغراقی داخل ہوا ہے اور اس کے معنی ہیں کہ ربا کا شرعی مفہوم (جس کا تعین سوال نمبر ۱) کے جواب میں کر دیا گیا ہے)۔ جن قسموں پر صادق آتا ہو وہ سب حرام ہیں اور تیسری آیت میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ تمہارا حق صرف راس المال ہے یعنی اصل رقم جو دی گئی تھی۔ ان آیات کے متن پر غور کرنے سے بغیر کسی بیرونی تشریح کے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کے قرض پر سود لینا حرام ہے خواہ تجارتی قرض ہو یا صرفی قرض ہو۔

اسی طرح كل قرض جر نفعا فهو ربا کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے اس میں بھی لفظ کل کے معنی ہیں ہر قرض اور نفعا کا لفظ بھی مطلق ہے خواہ سود مفرد ہو یا سود مرکب ہو ان واضح اور صریح نصوص عامہ کے ہوتے ہوئے کسی کا یہ کہنا کہ تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے اور یہ لایعنی بحث چھیڑنا کہ عربوں میں تجارتی قرضوں کا رواج تھا یا نہیں اور ان پر سود لیا جاتا تھا یا نہیں کہاں تک قابل توجہ ہو سکتا ہے؟ اس کا فیصلہ فاضل عدالت بڑی آسانی سے کر سکتی ہے۔

سوال نمبر ۱ کے جواب میں ربا کی تعریف کے سلسلے میں جو روایات نقل کی گئی ہیں ان میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ لوگ قرض پر سود لیتے تھے یہ کسی ایک روایت میں بھی نہیں آیا کہ یہ تجارتی قرضے نہیں تھے بلکہ ذاتی ضرورت کے قرضے تھے جو لوگ کہتے ہیں کہ تجارتی قرضے سرے سے مروج نہیں تھے ثبوت پیش کرنا ان کے ذمے ہے صرف نہیں کہہ دینا تو ثبوت نہیں ہے۔ ہم نے تو عمومی آیات واحادیث پیش کر دی ہیں جن میں مطلق قرض پر سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اب اگر کوئی ان میں تخصیص واستثناء کا دعوی کرتا ہے تو کوئی آیت یا کوئی صحیح الاسناد حدیث پیش کرے جس میں تجارتی اور غیر تجارتی قرضوں میں امتیاز کیا گیا ہو۔ اگرچہ تجارتی اور غیر تجارتی دونوں قسم کے قرضوں پر سود کی حرمت کے قائلین پر قانون اور اصول بحث کے مطابق یہ ثبوت پیش کرنا ضروری نہیں ہے کہ عربوں میں نزول قرآن کے وقت تجارتی قرضے بھی مروج تھے اور ان پر سود لینا بھی مروج تھا لیکن پھر بھی چند روایات پیش کی جاتی ہیں جن سے تجارتی اور کاروباری قرضوں کا ثبوت ملتا ہے۔ جن پر سود بھی لیا جاتا تھا مثلا:

(۱)۔ قال الضحاک كان ربا يتبايعون به فى الجاهلية فلما اسلموا امروا ان ياخذوا روائس اموالهم

ضحاک بن مزاحم تابعی فرماتے ہیں جاہلیت کے دور میں لوگ سودی خرید و فروکت یعنی کاروبار کرتے تھے جب یہ لوگ مسلمان ہوگئے تو ان کو حکم دیا گیا کہ صرف اصل رقم ہی وصول کرو۔

(تفسیر ابن جریر: ج۳، ص۱۰۷، تفسیر در منثور ج۲، ص ۱۰۸ اوقیہ، یتعاملون)

(۲)۔ ابن جریر نے وذروا ما بقی من الربا کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عن السدی قال نزلت هذه الایةفی العباس بن عبدالمطلب ورجل من بنی المغیرة کانا شریکین فی الجاهلیة سلفا فی الربا الی الناس من ثقیف من بنی عمرو بن عمیر فجاء الاسلام ولهم اموال عظیمہ فی الربا فانزل الله وذروا ما بقی من الربا (تفسیر ابن جریر طبع مصر 1954ء ج3 ص108)

سدی کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت عباس اور بنو مغیرہ کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو زمانہ جاہلیت میں کاروبار میں شریک تھے انہوں نے بنو ثقیف قبیلے کی ایک شاخ بنو عمرو کو سودی قرض پر مال دے رکھے تھے جب اسلام کا دور آیا (اور سود حرام کر دیا گیا) تو ان کا بہت سا مال سود میں لگا ہوا تھا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ چھوڑ دو جو بھی بقایا ہے سود میں سے۔

اس روایت میں دو تاجروں کے اس سودی قرضے کا ذکر ہے جو انہوں نے بنو عمرو قبیلے کو دے رکھا تھا اور یہ بہت زیادہ مال تھا جو بنو عمرو کے ذمے بقایا تھا۔

(۳)۔ ابن جریر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے بنو عمرو بھی بنو مغیرہ کو سودی قرضے دیا کرتے تھے۔

وکانت بنو عمرو بن عمیر بن عوف یاخذون الربا من بنی المغیرة وکانت بنو المغیرة یربون لهم فی الجاهلیة فجاء الاسلام ولهم علیهم مال کثیر فاتهم بون عمرو یطلبون رباهم فابی بنو المغیرة ان یعطوهم فی الاسلام و رفعوا ذالک الی عتاب بن اسید فکتب عتاب الی رسول الله صلی الله علیہ وآلہ وسلم فانزل الله یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربا الی قولہ ولا تظلمون فکتب رسول الله صلی الله علیہ وآلہ وسلم الی عتاب وقال ان رضوا والا فاذنهم بحرب (تفسیر ابن جریر، ج ۳، ص۱۰۸)

"دور جاہلیت میں بنو عمرو اور بنو مغیرہ کے درمیان سودی قرضوں کا لین دین تھا جب اسلام کا دور آیا تو بنو عمرو کا بنو مغیرہ نے اسلام کے دور میں سود دینے سے انکار کر دیا (دونوں قبیلے مسلمان ہوگئے تھے) بنو عمرو مکہ مکرمہ کے امیر عتاب بن اسید کے پاس اپنا دعوی لے کر گئے حضرت عتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خط لکھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا خوف کرو اور جو بھی بقایا ہے سود کا اسے چھوڑ دو الا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت لکھوا کر عتاب کو بھجوادی اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ اگر یہ لوگ سود چھوڑنے پر راضی ہوں تو بہت اچھا ورنہ ان کو جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔"

شان نزول سے متعلق ابن جریر کی درج بالا دونوں روایتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو عمرو کو بنو مغیرہ سودی قرض دیتے تھے اور بنو مغیرہ کو بنو عمرو سودی قرض دیتے تھے اور دونوں کا مال کثیر ایک دوسرے کے ذمے تھا اگر یہ تجارتی قرضے نہیں تھے تو کیا مال کثیر کا مالک گھریلو اخراجات کے لیے قرض لیا کرتا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کو تجارتی قرضے دیا کرتے تھے اور اسی پر سود دیا اور لیا کرتے تھے اور اس کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ چھوڑ دو جو بھی باقی ہو سود۔ جب آیت کا شان نزول ہی تجارتی قرضے ہیں تو ان کو اس آیت کے حکم سے خارج کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ابن جریر نے عکرمہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ بنو عمرو کے جو افراد بنو مغیرہ کو سودی قرض دیتے تھے اور ان

سے سودی قرض لیتے تھے ان میں مسعود ثقفی، عبد یالیل، حبیب اور ربیعہ بھی شامل تھے (ابن جریر: ج ۳، ص ۱۰۷) یہ نام بنو ثقیف کے سرداروں کے ہیں جو نادار اور بھوکے لوگ نہیں تھے بلکہ مالدار لوگ تھے ان کی مالداری کا ثبوت تو درج بالا روایت میں مال کثیر کے لفظ سے بھی ملتا ہے لیکن عکرمہ نے چند نام بھی بتا دیے ہیں جو طائف کے سرداروں کے نام ہیں اس کے علاوہ مولانا مودودی نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ۱۹۴۵ء کے ایک مضمون (بنکس) کے حوالے سے اور ایک دوسری مستند کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ جزیرۃ العرب کے آس پاس کے ملکوں یعنی عراق، مصر، شام، یونان اور روم میں تجارتی، صنعتی اور ریاستی اغراض کے لیے دیے گئے قرضوں پر سود لیا اور دیا جاتا تھا اور ان ممالک کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے تو یہ کیسے فرض کر لیا گیا کہ عرب تجارتی قرضوں پر سود سے باخبر نہیں تھے۔ (سود: ص ۲۸۳ تا ۲۹۰ طبع ۱۹۹۰ء)

مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب

تجارتی اور غیر تجارتی قرضوں کا فرق

پہلے سوال کے جواب میں تفصیلاً یہ بات عرض کر دی گئی ہے کہ "ربا" کی حقیقت ہر وہ زیادتی ہے جو کسی قرض کے مقابلہ میں طے کر کے لی اور دی جائے۔ جہاں کہیں یہ حقیقت پائی جائے گی وہ یقیناً ربا ہو گا اور قرآن و سنت کی رو سے قطعاً حرام ہو گا۔

ربا کی حقیقت پائے جانے کے بعد جس طرح یہ سوال لایعنی اور خارج از بحث ہیں کہ وہ ربا مفرد ہے یا مرکب، ربا کی مقدار کم ہے یا زیادہ، اسی طرح یہ سوال کہ قرض کس مقصد کے لیے لیا گیا تھا؟ ذاتی استعمال کے لیے یا تجارتی مقاصد کے لیے؟ خارج از بحث ہے۔

جتنی آیات و احادیث ربا کی حرمت کے بارے میں ہمارے سامنے موجود ہیں یا وہ تمام حوالے جو "ربا" کی تعریف کے سلسلہ میں ہم اوپر بیان کر کے آئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی تجارتی اور غیر تجارتی سود کا کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا بلکہ علی الاطلاق "ربا" کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

تجارتی قرضوں پر سود کے جواز کے سلسلہ میں ہمارے علم کی حد تک قرآن و حدیث سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جا سکی۔ صرف یہ دعوی کیا گیا ہے کہ چونکہ دور جاہلیت میں شخصی مقاصد کے لیے قرض لیا جاتا تھا اور اس زمانہ میں تجارتی اغراض کے لیے قرض لینے کا رواج نہ تھا اس لیے قرآن حکیم اور احادیث میں "ربا" کو حرام قرار دیا گیا ہے اس میں صرف وہ سود داخل ہے جو ذاتی اغراض کے لیے لیے جانے والے قرضوں پر طے شدہ ہو اور اگر قرض تجارتی مقصد کے لیے لیا جائے تو اس پر طے شدہ سود ربا میں داخل نہیں ہے گویا دوسرے لفظوں میں (Usury) ربا میں داخل ہے اور (Interest) ربا میں داخل نہیں۔ جن حضرات نے تجارتی اور غیر تجارتی سود میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے ان کا یہ فرق کسی لحاظ سے درست نہیں۔

اول تو اس لیے کہ جب قرآن و سنت اور آثار صحابہ کی رو سے ربا کی یہ تعریف کہ "ہر وہ شخص جس پر معاہدہ کے ذریعہ کوئی اضافہ مقرر کیا گیا ہو، متعین ہو گی تو اس کے بعد یہ تحقیق بالکل غیر ضروری ہے کہ قرض کس مقصد کے لیے حاصل کیا جا رہا ہے، اور اس میں تجارتی اور صرفی اغراض کا فرق نکالنا قرآن و سنت کے مفہوم میں ایک بے دلیل زیادتی کے مترادف ہے۔

دوسرے یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ دور جاہلیت پھر عہد رسالت اور عہد صحابہ میں تجارتی قرضوں کا رواج نہ تھا، روایات میں اس دور کے کئی تجارتی قرضوں کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کے چند حوالے درج ذیل ہیں:

۱۔ دور جاہلیت میں تجارتی سود بکثرت رائج تھا۔ مکہ، طائف اور نجران سودی مراکز کے طور پر مشہور تھے، چونکہ یہاں صنعت و زراعت کا زیادہ رواج نہ تھا اس لیے تجارت پر سارا زور تھا، سرمایہ دار اپنی رقم تجارت کے لیے قرض دیا کرتے تھے اور متعین سود وصول کرتے تھے۔

(دیکھیں الدکتور جواد علی: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۷، ص ۴۱۹ تا ۴۲۷)

۲۔ طائف کے باشندوں کا جو زیادہ تر ثقیف کے قبیلہ سے تھے، سب سے بڑا کاروبار "ربا" (سودی لین دین) تھا، آبادی کے بعض طبقوں کا تو واحد کاروبار ہی یہی تھا۔ سودی لین دین کے اس طرح معاشی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہو جانے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف سے صلح کرتے وقت صلح میں ایک شرط صراحتاً یہ رکھی تھی کہ سودی لین دین بالکلیہ موقوف کر دیا جائے گا، ساتھ ہی ساتھ جو سود دوسروں کا ان پر یا ان کا دوسرے پر چڑھ چکا ہے اسے یک قلم ترک کر دیا جائے گا۔ طائف کے سودی کاروبار کرنے والے صرف اپنے شہر کے لوگوں سے ہی سود کا لین دین نہ رکھتے تھے بلکہ مکے والوں کو بھی جو بنیادی طور پر تاجر تھے سود پر روپیہ فراہم کرتے تھے۔ یہ سود روپیہ اور سامان دونوں صورتوں میں وصول کیا جاتا تھا، بنو مغیرہ جو مکہ کے قریشیوں کی ایک شاخ تھے ان کے مستقل گاہک تھے۔

(حوالوں کے لیے دیکھیں: فضل الرحمان: تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے علی گڑھ یونیورسٹی ص ۱۰ مطبوع علی گڑھ ۱۹۶۷ء)

۳۔ تفسیر ابن جریر میں روایت ہے کہ بنو عمر بن عمیر بن عوف، بنو المغیرہ سے قرض لیا کرتے تھے (السیوطی: الدر المنثور: ج ۱، ص ۳۶۶) اس روایت اور اس جیسی کئی روایتوں میں قبائل عرب کا باہم قرض لینا دینا مذکورہ ہے۔ یہ شخصی قرضے نہ تھے جنہیں صرفی کہا جائے بلکہ اجتماعی قرضے تھے، کیونکہ قبائل عرب کی حیثیت مشترک سرمایہ کمپنیوں جیسی تھی، جن کے ذریعے قبیلہ کے افراد مشترک تجارت کیا کرتے تھے، لہٰذا یہ قرضے شخصی ضروریات کے بجائے تجارتی اغراض ہی کے لیے ہوا کرتے تھے (مفتی محمد شفیع اردو دائرہ معارف اسلامیہ مقالہ "ربوا" ج ۱۰، ص ۱۷۵)

رہی یہ بات کہ ان قبیلوں کی حیثیت تجارتی کمپنیوں جیسی تھی اور ایک قبیلہ کے افراد اپنا مال ایک جگہ جمع کر کے اجتماعی انداز میں اس سے تجارت کیا کرتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو جنگ بدر کا محرک بنا، ابو سفیان (حالت کفر میں) ایک تجارتی قافلہ شام سے لے کر آ رہے تھے اس کے بارے میں تاریخ کہتی ہے کہ اس میں مکہ کے ہر فرد کا حصہ تھا، علامہ زرقانی اپنی مشہور کتاب (شرح المواہب اللدنیہ ۱/۴۱۱) میں لکھتے ہیں "لم یبق قرشی ولا قرشیۃ لہ مثقال الابعث بہ العیر" (یعنی کوئی قریشی مرد ہو یا عورت، ایسا نہ تھا جس کے پاس ایک درہم ہو اور وہ اس نے قافلہ میں نہ بھیجا ہو)۔ (محمد تقی عثمانی: تجارتی سود عقل اور شرع کی روشنی میں، حصہ دوم، مسئلہ سود، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی)

۴۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحیح روایات سے ثابت ہے کہ وہ لوگوں کی امانتیں اپنے پاس شرط پر رکھتے تھے کہ یہ رقوم قرض قرار دے دی جائیں، تاکہ اس سے رقم کے مالک کا یہ فائدہ ہو کہ اس کا مال ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے اور اپنا یہ فائدہ ہو کہ اسے تجارت میں لگا کر اس سے نفع حاصل کیا جا سکے۔ چنانچہ ان کی شہادت کے وقت بائیس لاکھ کی رقم ان پر قرض تھی جب کہ کل پانچ کروڑ لاکھ کی رقم انہوں نے بطور میراث چھوڑی۔ (امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد، ۱/۴۴۱) مطبوعہ دہلی ۱۳۵۷، نیز دیکھیں فتح الباری ۲/۳۲۷)

ظاہر ہے کہ حضرت زبیر جیسے متمول صحابی نے بائیس لاکھ کی یہ رقم وقتی ضرورت کے لیے قرض نہیں لی تھی، بلکہ تجارتی مقصد کے لیے اسے قرض لیا گیا تھا۔ یہ مثال جہاں تجارتی مقاصد کے لیے قرض لینے کی دلیل ہے وہاں یہ روایت عہد صحابہ میں بینکنگ سے ملتی جلتی شکل کی بھی دلیل ہے۔

۵۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ کو عراق کے گورنر حضرت ابو موسی اشعری نے بیت المال سے قرض دیا جسے ان دونوں نے اپنے تجارتی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ (دیکھیں موطا امام مالک، ص ۲۸۵، کتاب القراض بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۷۵/۱۰)

حضرت عمر کے صاحبزادگان کے اس واقعہ کی مزید تفصیل یہ ہے کہ جب انہوں نے بیت المال سے قرض لی ہوئی اس رقم سے تجارت کر کے نفع کمایا تو امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ جب دوسرے لوگوں کو بیت المال سے قرض نہیں دیا گیا تو تم میں کیا خصوصیت تھی؟ سارا نفع واپس کرو حضرت عبیداللہ نے اگرچہ اس کی معقول وجوہ بیان کیں مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ بالآخر مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "اگر آپ اس قرض کو قراض (یعنی مضاربت) قرار دے دیں تو اچھا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے منظور کر لیا اور آدھا نفع حضرت عبیداللہ کے پاس رہنے دیا اور آدھا نفع واپس لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔

(حضرت مفتی محمد شفیع، مقالہ ربوا، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، طبع لاہور)

۶۔ ہند بنت عتبہ نے حضرت عمر کے زمانہ (۲۳ھ) میں تجارت کی غرض سے بیت المال سے قرض لیا اور پھر کلب میں جا کر اس سے تجارت کی۔

(طبری طبع قاہرہ ۸۷/۳)

حضرت عمر فاروق نے بیت المال سے ایک بڑی رقم قرض یا قراض کے طور پر لی تھی اور انتقال سے پہلے انہوں نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن عمر کو بلا کر یہ ہدایت کی کہ وہ ان کے اموال فروخت کر کے یہ رقم جلد از جلد بیت المال میں واپس کر دیں۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

(محمد تقی عثمانی تکملہ فتح الملہم، جلد اول ص ۵۷۳، طبع کراچی، بحوالہ طبقات ۳۵۸/۳)

نوٹ:

مذکورہ بالا تینوں واقعات نمبر ۵، ۶ اور نمبر ۷ سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

(الف)۔ ایسے قرضے نجی سطح کے علاوہ حکومت کے مرکزی ادارہ "بیت المال" سے بھی دیے جاتے تھے۔

(ب)۔ تجارتی قرضوں کا رواج عہد صحابہ میں موجود تھا۔

(ج)۔ ان تجارتی قرضوں کا رواج صرف دو ہی طرح تھا یا بغیر کسی نفع کے قرض، یا پھر قراض یعنی مضاربت کی شکل میں اس کے علاوہ تیسری صورت نہ تھی۔

۸۔ سنن بیہقی میں یہ واقعہ مذکورہ ہے کہ عبدالرحمان بن یعقوب نے تجارتی مقاصد کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قرض کی درخواست کی، گفتگو کے بعد طے پایا کہ یہ قرض، قراض یعنی مضاربت کی صورت میں دیا جائے گا۔

(بیہقی: السنن الکبری ۱۱/۶، طبع ملتان)

۹۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس بے شمار امانتیں تھیں، اور وہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی طرح ایسی رقوم کو امانت کے طور پر رکھنے کے بجائے قرض کے طور پر رکھتے تھے، اور ان رقوم کو تجارت میں لگاتے تھے۔ اس طرح ایک تو لوگوں کے اموال ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتے تھے اور ان کی ادائیگی یقینی ہو جاتی تھی، دوسرے امام صاحب کو اپنی زبردست تجارت کے لیے معقول مقدار میں سرمایہ مل جاتا تھا۔ اس تجارتی سرمایہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات کے وقت ان کے پاس پانچ کروڑ کی رقم تھی۔

(دیکھیں الکردی: مناقب النعمان: ج۱، ص ۲۲ بحوالہ فضل الرحمان تجارتی سود، ص ۳۰، مطبعہ علی گڑھ اور مناظر احسن گیلانی: امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۱۰۴، تا ص ۱۰۶، مطبوع کراچی)

خلاصہ

ان چند حوالوں سے ہی یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ تجارتی قرضوں کا رواج شروع سے چلا آ رہا ہے، اور یہ کہنا کہ تجارتی قرضوں کا وجود دو صدی قبل سے شروع ہوا ہے تاریخ سے ناواقفی کے مترادف ہے۔ ویسے بھی یہ بات کیسے قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ عرب جن کی زندگی کا دارومدار ایک حد تک تجارت پر تھا وہ تجارتی قرضوں سے ناواقف ہوں؟

اس لیے "ربا" کی حرمت میں تجارتی اور غیر تجارتی کا فرق پیدا کرنا قرآن وسنت کے صریح دلائل کے بھی خلاف ہے اور تاریخ کے بھی خلاف ہے۔ اور ایسا کہنا قرآن وسنت کی نصوص اور تاریخی دلائل کے علی الرغم بلا دلیل ایک بات ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

ویسے بھی جب "ربا" کے بارے میں (سوال نمبر ا کے جواب میں) یہ طے ہو چکا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی حقیقت "ہر وہ زیادتی ہے جو کسی قرض کے مقابلہ میں طے کر کے لی اور دی جائے" تو اس میں یہ سوال خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ قرض لینے والا کس مقصد کے لیے قرض لے رہا ہے؟ اس لیے شخصی قرضے ہوں یا تجارتی قرضے قرآن وسنت کے مطابق دونوں پر سود لینا "ربا" میں داخل ہے اور حرام ہے۔

ایک بنیادی اصول

قرض کے معاملہ میں اصول یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے کو قرض دے رہا ہے اس میں اسلامی نقطہ نظر سے اس کو پہلے یہ متعین کرنا چاہیے کہ وہ یہ روپیہ اس شخص کی امداد کے طور پر دے رہا ہے یا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہا ہے۔ اگر وہ یہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی رہنے دے اور نفع کے ہر مطالبہ سے دستبردار ہو جائے، وہ اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہو گا جتنے اس نے قرض دیے تھے۔

اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان دونوں کی ذمہ داری اٹھانی پڑے گی، ان دو صورتوں کے علاوہ اسلام میں تیسری راہ نہیں ہے جس کے ذریعہ کوئی فریق اپنا نفع ہر حال میں متعین کر لے جب کہ دوسرے کا نفع موہوم اور مشتبہ ہو۔

(حضرت مفتی محمد شفیع سوال نامہ ربا کا جواب۔ مشمولہ کتاب ہمارا معاشی نظام: ص ۱۱۹، مطبوعہ مکتبہ دار العلوم۔ کراچی)

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

سوال نمبر (۱) کے جواب کے تحت تجارتی اور غیر تجارتی سود میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔

سید معروف شاہ شیرازی صاحب

اسلامی تصورات کے مطابق ہر وہ قرضہ جس میں مدت کے عوض نفع حاصل ہوتا ہو وہ حرام ہے۔ كل قرض جر نفعا فهو حرام (جس قرض پر بھی نفع لیا جائے وہ حرام ہے) ہاں یہ بات ضرور ہے جو اگر زندگی کی ناگزیر ضروریات کے لیے کسی کو سود پر قرض دیا جائے تو وہ حرام ہونے کے ساتھ ساتھ ظلم اور عدوان بھی ہوگا اور کوئی ایسا شخص صحیح مسلمان نہیں ہو سکتا۔

دور جدید میں جواز ربا کے قائلین کا استدلال ہی صرف یہ ہے کہ تجارتی مقاصد کے لیے قرض لے کر ایک شخص کماتا ہے اور غیر تجارتی قرضے بلا سود ہوں۔ اس لیے کہ وہ ضرورت کے ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیر تجارتی قرضے بھی عملاً کسی ضرورت کے لیے نہیں ہوتے۔

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

No, it will not be lawful under Islamic law to differentiate between business loans and consumption loans. As noted earlier the Law-Giver has prohibited interest without regard to the purpose of the loan, whether it is for business or consumption. Furthermore, the interest-bearing loans in the period immediately before Islam were mostly business loans and the interest due which the Prophet declared to be void in his Hajj sermon was mostly interest due on business loans. Besides having no basis in Islamic law or history, a differentiation between business and consumption loan has no economic rationale. Also, once allowed in the business sector interest is bound to engulf the consumption sector also.

Mr. Hassanuz Zaman

Please see answer to Question No.1.

Dr. Ramzan Akhtar

The business activity will be financed through legitimate means, like Mudarabah and Musharakah and also some of the other instruments as outlined in the answer to Question No.6. The consumption loan will be available as Qarz-e-Hasana through Islamic banking system.

Prof. Dr. Kharofa

In Islam, there is no difference between a consumption loan and a business loan regarding the interest.

Whatever is paid more than the loan conditionally would be considered as interest "Riba". The first one to differentiate between the two loans was "Sharl Jeed" then Dr. Dawaleeby. On page 353 of my dissertation (Aqd al-Oardh) there is more detail on this point. I have said that there is no difference between business loans and consumption loans (Sycd Qutb in his book "AL' ADALAH AL-IJTlMA'YY AH said the same on page 123).

Dr. Dawaleeby has delivered a lecture in 1950 in Paris and said that the loans in the past were for consumption but now the loans are for the business, therefore, we should legalise them. I had investigated this opinion and found it to be the opinion of Sharl Jeed, the Famous Economist, and the son of the famous writer and author Andree Jeed.

In fact this opinion is not valid and is baseless. Some people say that the Arabs were dealing mostly with consumption loans only, and that is why Allah (Almighty) has forbidden the interest. I have discussed this point and proved that Arabs, prior to Islam, were dealing in trade and business with different countries in the world, therefore, this is a pure accusation.

Nawazish Ali Zaidi

Interest charged on any kind of loan is Riba. This has been explained in detail in reply to question one.

Mr. M. Arshad Javed

Business Loans and Consumption Loans cannot be treated on equal footing. Perhaps 'Riba' relates to Consumption Loans. Was there a concept of Business loan at the time of the Prophet (P.B.U.H.)? Perhaps the Business Loans were not in existence. Instead such business was carried out in the form of Modaraba, Lot of-research work is still required to makepresent-day business practices compatible with the Injunctions of Islam.

Mr. M. Ziaul Haq

There is no difference in Islamic law whether the loans on interest are for consumption purposes or for productive business purposes.

Question No. 12. If interest is fully abolished, what would be inducements in an Islamic Economic System to provide incentives for saving and for economizing the use of capital?

سوال نمبر ۱۲: اگر سود کو قطعی طور پر ختم کر دیا جائے تو اسلامی معیشت میں لوگوں کو بچت پر ابھارنے اور سرمایہ کے استعمال میں کفایت شعاری کی ترغیب دینے کے لیے کون سے محرکات استعمال کیے جائیں گے؟

مولانا گوہر رحمان صاحب

تجارتی نفع کے ذریعے لوگوں کو بچت پر ابھارا جائے گا، اگر حرام نفع محرک بن سکتا ہے تو حلال نفع کیوں محرک نہیں بنے گا باقی رہا خسارے کا خطرہ جو سود میں نہیں ہوتا تو پہلی بات تو یہ ہے کہ تجارت میں خسارے کا خطرہ نادر اور قلیل ہوتا ہے اور نفع کی امید زیادہ ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو مارکیٹیں بند ہو جاتیں، اس لیے خسارے کے نادر الوقوع خطرے کی وجہ سے لوگ اپنی بچتیں کاروبار میں لگانے سے اتنے خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو تجارت کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس اتنا زیادہ سرمایہ نہیں ہے کہ وہ اس سے کاروبار شروع کر سکیں۔ اگر ان کے سامنے بینکاری کا ایسا طریقہ موجود ہو جس پر وہ اپنی تھوڑی سی بچت کو بھی تجارت میں لگا سکیں یعنی مضاربہ یا مشارکہ کا طریقہ تو وہ ضرور بچت کر کے اس کاروبار میں حصہ لیں گے اور خسارے کا امکان ان کو خوف زدہ نہیں کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ نفع نقصان میں شراکت کا نظام معاشی توازن قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اسی توازن کو قائم کرنے کے لیے تو ہم سود کو ختم کرانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی صاحب

سود کو ختم کرنے کے بعد اسلامی معاشرہ کے افراد کو بچت پر ابھارنے اور کفایت شعاری کی ترغیب ان تمام معاشی تعلیمات کے ذریعہ دی جاسکتی ہے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے فرمان درج ذیل ہیں:

(الف)۔ ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔

(بنی اسرائیل۔ ۲۹

(ب)۔ و آت ذالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطان لربہ کفورا

(بنی اسرائیل: ۲۶۔۲۸)

(ج)۔ والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان من ذالک قواما۔ (الفرقان: ۶۸)

(د)۔ یسئلونک ما ذا ینفقون قال العفو (البقرۃ:۲۱۹)

(ذ)۔ و لتنظر نفس ما قدمت لغد (الحشر:۱۸)

اس کے علاوہ چند احادیث نبوی بھی دیکھیے۔

(الف)۔ مما عال من اقتصد (مسند احمد: ج۱، ص۴۴۸)

(ب)۔ انک ان تدع وارثک غنیا خیر من ان تدعہ فقیرا تکفف الناس (مسند احمد، ج۵، ص ۱۹۸)

(د)۔ ان العدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جز من خمسۃ و عشرین جز من النبوۃ (مسند احمد ج۱، ص ۲۹۶)

(ذ)۔ طوبی لمن ھدی الی الاسلام وکان عیشہ کفافا۔ (مسند احمد، ج۵، ص ۲۵۵)

علاوہ ازیں عملی میدان میں شراکت کی بنیاد پر کاروبار کو ترقی دینے نجی طور پر رائج قسط بندی کے جزوی طریقہ کار کی حوصلہ افزائی کرنے اور دیگر بچت کی اسکیموں کو رائج کرنے سے یہ مقصد بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے مختلف فاؤنڈیشن کا قیام بھی اس جانب ایک اہم قدم ہو گا۔

سید معروف شاہ شیرازی صاحب 06—05—17

اسلامی نظام اس قدر جامع ہے اور اس کی اخلاقی تعلیمات اس قدر ٹھوس بنیادوں پر استوار ہیں کہ اگر حکومت اسلامی اخلاق کو پھیلائے تو فضول خرچی، عیاشی اور اسراف کے تمام دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کسی اسلامی معاشرہ میں بچت کرنے کے لیے کسی مصنوعی سکیم کی سرے سے ضرورت ہی نہ ہو گی، البتہ موجود حالات میں بعض حقائق کی نشاندہی ضروری ہے اور بعض تجاویز درج ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بینک سے تعرض محض اس لیے نہیں کرتی کہ اس میں سودی کاروبار ہوتا ہے، بعض لوگ کرنٹ اکاؤنٹ محض چیکوں اور ڈرافٹوں کے کیش کرانے کی حد تک کھولتے۔۔۔ بے شمار لوگ ایسے تھے جو اکاؤنٹ کھولتے وقت لکھ دیتے تھے کہ ہم سود نہ لیں گے جب سود کا نظام قانونا ختم کر دیا جائے گا، مسلمانوں اور دین داروں کو بینک میں امانت رکھنے میں کوئی ہیجان نہ ہو گا تو بینک کے بچت کھاتوں میں بڑی بڑی رقمیں جمع ہوں گی۔

۲۔ جب سودی نظام کا ظالمانہ طریقہ زر اندوزی ختم ہو گا تو سرمایہ رکھنے والے لوگ دوسرے محفوظ اور جائز مدوں میں سرمایہ لگائیں گے۔ اس طرح درج ذیل تبدیلیاں از خود واقعہ ہوں گی:

(الف)۔ مضاربت کو فروغ ہو گا۔

(ب)۔ ساکھ والی کمپنیوں کے حصص خریدے جائیں گے۔

(۳)۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بینکوں کا جال پورے ملک میں پھیلایا جائے اور ہر گاؤں میں ایک ایسا بینک کھولا جائے جسے صرف ایک شخص چلاتا ہو، اس طرح تمام لوگ اپنا سرمایہ الماریوں کی بجائے بینک میں رکھیں گے۔

۴۔ ایک تجویز یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بڑی کمپنیوں کے حصص کی فروخت کا انتظام کیا جائے مثلاً۔۔۔ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر کے تمام بینکوں میں ملک کی بڑی بڑی کمپنیوں کے حصص کی فروخت انتظام ہونا چاہیے۔

لیکن اس سوال کے بارے میں اسلامی سوچ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مال جمع کرنے کے بجائے مال کے خرچ فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے اور جدید معاشی اصولوں کے مطابق بھی دولت کی تقسیم اور اسے جائز مدات میں خرچ کرنے ہی سے سرمایہ کی گردش کا عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ "کیلا یکون دولة بین الاغنیاء: ۵۹:۷) (تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے) اسلامی معیشت کی اساسی پالیسی بچت نہیں ہے، خرچ اور دولت کی تقسیم ہے۔ اس کے لیے نظام زکوۃ، عشر، فئے، صدقات خود اپنے اوپر خرچ کرنا، اولاد پر خرچ کرنے کی ترغیب اور نذرانہ کفارات تمام ایسے اقدامات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسی بچت کی نہیں ہے، بلکہ صرف کی ہے۔ صرف ایک قدغن ہے اور وہ یہ کہ اسراف نہ کیا جائے "کلوا واشربوا ولا تسرفوا"۔

بعض وہ لوگ جو یہودیوں کی ذہنیت رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پسماندہ ممالک میں بچت ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ چلو تمام پاکستانی قوت لایموت کے علاوہ سب کچھ بچت کریں اور اس سے ایک کارخانہ لگا دیا جائے، مثلاً جوتوں اور کپڑے کا کارخانہ، مگر لوگوں نے اپنی ضرورت کو زیرو یونٹ تک لا کر بچت شروع کر دی ہے، اس کارخانے کی پروڈکشن کس طرح نکلے۔

دوسری جانب صورت حالات یہ ہو کہ لوگ ایک جوڑے کے بدلے دو جوڑے کپڑے خریدیں اور ایک جوڑا کے بدلے دو جوڑے جوتے خریدنے کا فیصلہ کریں تو یہی دو کارخانے چلنا شروع ہوں اور لوگوں کی خرچ کی ہوئی تمام رقم کارخانوں میں جمع ہو جائے۔

اب یہودیانہ بچت سے کارخانہ تو لگ گیا مگر مال کی نکاسی رک گئی اور اسلامی نظریہ انفاق سے ہر شخص کی جیب کی بچت کارخانے میں پہنچ گئی۔ سوال یہ ہے کہ انفاق کا نظریہ بہتر رہا یا بچت کا؟۔۔۔ یہ بات درست ہے کہ کسی کارخانے کے آغاز سے تو بچت کی قدرے ضرورت ہے لیکن اسے چالو رکھنے کے لیے انفاق کی ضرورت ہے۔

Dr. Nejat Ullah Siddiqui

People save for many reasons other than the desire to make more money through savings. They save for their children and for their own old age. They save to meet possible contingencies, like accidents, illness, etc. Some also save in order to be called wealthy, or as a means to acquiring power. These reasons will continue to make people save in an interest-free economy. In so' far as people do save in order to make more money there will be opportunities to do so even after interest is abolished. They will be able to invest their savings through Islamic financial institutions operating on the basis of partnership, profit-sharing, leasing, salam, murabaha, etc. As to completely risk free investment with predetermined guaranteed returns, they will not be available in an interest-free society. This in itself cannot have any significant negative impact on saving. After all, even in present-day interest based system people continue to save despite the rate of inf1ation being in some periods larger than the rate of interest and despite bank failures. Regarding economy in the use of capital, people will be motivated to do so because capital will still carry a cost to be paid by the user, and because users of capital are motivated by profit which can accrue only when capital is used economically (i.e. when its expected return is more than its expected cost). The cost of capital in an interest-free economy will be generally speaking, the expected average rate of profit. Even those who acquire the use of capital on profit-sharing basis will have to take this cost into account since they must catter for the expectations of the supplier of capital in order to continue in business. The fact that this expected average rate of profit is not written into the contract (as the rate of interest is presently written) does not affect this economic reality. However, the absence of this mention does provide the needed relief to the entrepreneur in case he fails to make that much profit despite his best efforts. The nature of the world is such that justice cannot be done without providing this relief.

Mr. Hassanuz Zaman

Savings were made when banks did not exist and are being made by those who do not earn any interest on these savings nor do they accept any return on their holdings. This has been so for thousands of years. If interest is abolished personal savings will be marginally affected. Corporate savings would seek least risky portfolios rather than highest yielding opportunities.

Dr. Ramzau.Akntar

It is very well recognized that interest is not the primary or an important factor for the saving. The overall savings in the economy primarily depend upon the level of income. Some of the basic motivating factors for saving are:

(a) Meeting future exigencies,

(b) Providing for old age, and

(c) Bequeaths

Since these factors will remain even after the elimination of interest, therefore, it is most likely that the overall rate or level of saving will not be affected significantly (after the abolition of Riba from the economy):

Muslim economists have suggested a wide range of saving truments which will be available to the potential savers in an interest-free economy.[7] These instruments vary in terms of liquidity, risks and returns so as to match preferences of the savers. Apart from existing profit-based instruments like shares of joint stock company N.I.T. Units, ICP Mutual Funds and Investors Deposit Account and Participation Term Certificate, new saving instruments compatible with Shariah, can be brought into being. Amoung those, Mudarabah bonds floated by the Government as well as by the private concerns can play important role. Similarly, a variably dividend security issued by the State Bank can serve as an important instrument. The holders of this security will participate in its profits. This will provide a low risk medium of investment for the private investors. Also, it can serve as a substitute for Government Bonds and TreasuryBills for Investment of the surplus funds of the banks and other financial institutions.

Lastly, the Government Bonds bearing no interest can be issued when the holders may enjoy tax concessions.

As regards the role of interest as a discounting factor, it is pointed out that even in the Western Countries; the pure rate of interest is considered to be an inadequate measure as a discount factor. It is usually adjusted for a risk-premium.

In an Islamic Economy, the rate of return on real investment can play the role of discount factor. Practically, it can be, approximated by the return on NIT Units.

Prof Dr. Kharofa

Islam does not want its follower to stay without Career. In the book "Subul Al-Salam" by Al-San'any the author has mentioned, as I remember, that there is difference between the Muslim scholars as to which is better or has more blessings: The trade or agriculture? Some says the first one, and some says the opposite. There are hundreds of AVENUES that Muslims can make their living by legitimate ways and earn rhe money.

[7] See for example, "Report of the workshop on Elimination of Interest from Government Transactions. IIIE, Pakistan, pp, 11--13.

People say: The trust has been lost and the confidence in many people almost has no existence to the extent that one can say "Who can trust whom"?

The answer should be:' Even so, Muslims are obliged to follow the Islamic teaching in every walk of life and to make their living by legitimate way.

"Legitimate earning" to the Muslim should be the only "Incentive"

Mr. Nawazish Ali Zaidi

It has been proved beyond doubt that saving is a function of level of income. People save even when real rate of interest is negative.

It is also a misunderstanding that interest helps in economizing the use of capital. Interest, in fact, has resulted in misallocation of resoureces. Pakistan's domestic borrowings stand at over Rs, 400billion because Government borrowed by offering higher rates of interest. Resources were, in fact, hijacked by the Government. Otherwise, these could have been put to productive use in private sector.

Mr. M. Arshad Javed

Even the Capitalist Economists today claim that Interest is not the sole inducement for saving and for economising the use of capital. It is a proven phenomenon that, other motives for savings are rnuch more attractive and powerful as compared to Interest. Even Keynes himself advocates more for Liquidity or Transaction Motive and Precautionary Motive as compared to his Speculative Motive. Besides safety and security, people want a better return on their idle money. Unfortunately, they have no other alternative available except to put their Savings in Interest avenues. The Profit and Loss Sharing Schemes backed by the State guarantee can be a better alternative.

Mr. M. ZiaulHaq

Interest cannot be abolished without abolishing capitalist practices in all the sectors of capitalist economy. If interest, as the price of capital, is abolished then there remains no inducements for savings and for efficient allocation of capital resoureces unless capital resoureces are socialized and all saving for capital formation, is done by the Islamic State.

APPENDIX B

SUMMARY OF CONCLUSIONS AND RECOMMENDATIONS

Introduction

The elimination of interest occupies a key position in the establishment of the Islamic order.Pakistan being an ideological State, the abolition of riba has from the very

beginning formed an integral part of State Policy as enshrined in her Constitution. Yet there has hitherto been hardly any noteworthy progress towards the elimination of interest from the country's economy. However, in the recent past, the President of Pakistan not only entrusted to the Council of Islamic Ideology the task of preparing a blueprint of an interest-free economic system but has also set a time limit of three years for the elimination of interest from the economy. Further, the Presidential declaration has been given the form of a Constitutional provision. The Council, soon after its reconstitution, appointed a Panel of Economists and Bankers which was assigned the responsibility, inter alia, of examining the technical aspects of the elimination of interest and recommending ways and means for reorganising the country's banking system in conformity with the Sharia. The present Report of the Council is based largely on the work accomplished by the Panel. However, in adopting the recommendations of the Panel, the Council bas incorporated amendments, wherever necessary, so as to ensure complete conformity with theSharia (para.1).

2. The basic work haVing been accomplished, the next step that needs to be taken by the Government is the setting up of various working groups which should be charged with the task of working out the details of the new system. It needs to be emphasised that during the whole process extreme care must be exercised to ensure that the basic stipulationsof the new system are faithfully adhered to. (para.2). .

3. The elimination of interest is but a part of the overall value system of Islam and this measure alone cannot be expected to transform the entire economic system in accordance with the Islamic vision. The need for reformatory measures at moral building and eradication of false values of life was emphasised by the Council earlier while submitting its recommendations on the laws of hudood and the introduction of Zakat. However, now as the country is poised for the introduction of an interest-free banking system, this need has increased immeasurably in its urgency. For this purpose the mass media need to be mobilised forthwith for launching a well thought-out persuasive campaign designed to bring home to the people the details of the new system and persuade them to willingly and wholeheartedly accept the challenge and to act with a missionary zeal. (para. 3)

4. With a view to ensuring the success of the new system of banking, the Government should carry out a thorough reappraisal of the tax system focussing in particular on the need for greatly simplifying the system of Income Tax. (para4).

5. Ideally the real alternatives to interest under an Islamic economic system are profit/loss sharing or.qard-i-hasan i.e., loaning without additional charge over and above the principal amount. Although the recommendations are based largely on the principle of profit/loss sharing, yet some of the recommendations lean on other methods in view of the difficulties faced in the practical application of the profit/loss sharing system in its pure form on account of the prevalent standards of morality in the society. These alternative methods are, however, no more than a second best solution from the viewpoint of an ideal Islamic economic system. This is because of the fact that although

these alternative methods are free of the interest element in the form in which they arc specifically laid down in this Report; there is a danger that this could eventually be misused as a means for opening a back-door for interest alongwith its attendant evils. They should, therefore, be applied to the minimum extent that maybe unavoidably necessary, and that their use as general techniques of financing must never be allowed. In this connection, a basic policy decision may be taken to the effect that with the passage of time the operational field of PLS and qard-i-hasan should gradually be expanded while that of the other alternatives reduced. At the same time, efforts must be stepped up to bring about a substantial improvement in the standards of honesty in the society and to remove illiteracy, because both dishonesty and illiteracy militate against the success of the new system (para. 5).

6. For remodelling the bankingsystem on Islamic lines it is indispensable to make necessary changes in the existing laws having a bearing on the operations of banks so as to bring these laws in conformity with the Sharia. The task of amending and remodelling these laws may be taken in hand simultaneously with the initiative of the process of eliminating interest. (para. 6)

Chapter 1: Issues, Problems and Strategy

The Holy Ouran explicitly and emphatically prohibits riba and there is complete unanimity among all schools of thought in Islam that the term riba stands for interest in all its types and forms. (para. 1.1)

2. The prohibition of interest in respect of consumption loans rests mainly on humane considerations while the main rationale for prohibition of interest in respect of loans for production purposes stems from the concept of justice which is the cornerstone of the Islamic philosophy of social life. The basis of co-operation between capital and enterprise which Islam cherishes is equitable sharing of the risks and gains between them, which is possible under a system of profit/loss sharing (PLS). (paras. 1.3-1.4).

3. Serious reservations are often expressed about the successful applicability of the PLS system in our conditions on account of the fact that most of the enterprises either do not maintain accounts or do not maintain them properly or keep different sets of accounts for different purposes. In this context, the Council gave consideration to a number of other possible devices also to replace the interest system, which may be in conformity with Sharia. (paras 1.5- 1.8)

4. The alternative methods considered are as follows:

(a) Service charge. --If interest is replaced by a service charge, banks and other financial institutions would provide loans with full guarantee for repayment of the principal plus a service charge sufficient to cover the administrative costs of the financial institution. The Council came to the conclusion that although this solution may appear to meet the requirement of the Sharia in the literal sense, it would for a number of reasons,

neither accord with the true spirit of Islam nor would it be advisable from the economic point of view. (para. 1.9)

(b) Indexation of bank deposits and advances. --Under this sytem the liability of a borrower to the banking system would be adjusted in money terms to reflect the change in the value of money, as measured by a price index, during the period the borrowing remained outstanding. Lending by banks on this basis would enable them to compensate the depositors for the change in the value of money. It was felt that though indexation may constitute a favourable factor for the growth of savings in an inflationary situation by preserving the real value of money savings, its use on the side of bank advances would create a number of problems and may greatly hurt productive activity. Moreover, under the Sharia, currency transactions are not treated differently from commodity transactions in so far as lending and borrowings are concerned. As such, no allowance can be made for the change in the value of money. (para. 1.10).

(c) Leasing.--Leasing isa relatively new method of long-term financing that is gaining popularity in the industrialised countries. Under this method, the lessor retains the ownership of the asset and the lessee has possession and use of asset on payment of specified rentals over a period. The use of this method can enable banks and other financial institutions to provide medium and long-term finance either directly or through their leasing subsidiaries without having to look into the accounts of the firms. However, as against the existing practice, the cost of insurance of the assets will have to be borne by the lessor in order to make this method conform to the principles of Sharia. (paras 1.11-1.13).

(d) Investment auctioning:- Under this system, commercial banks may form a consortium with long-term financing institutions and formulate industrial projects with complete details. The consortium may then announce the project with the assurance to make available the needed plant and machinery of specific description and call for bids from prospective investors for the purchase of the machinery. The project may be awarded to the highest bidder if the party is considered to be a sound one. Otherwise, the project may be awarded to the next highest bidder considered capable of efficient implementation and running of the project. The· most significant advantage of this system, from the economic point of view, would be that the price paid by the investor would adequately reflect the potential profitability of the project which is essential for efficient allocation of resources. (paras. l.t4-1.15).

(e) Bai Muajjal:-- It isa sale under 'which the price of the item involved is payable on a deferred basis either in lump sum or in instalments. This system could be of considerable use in financing current input requirements of industry and agriculture as well as in the financing of domestic and import trade. However, although this mode of financing is understood to be permissible under the Sharia, it would not be advisable to use it widely or indiscriminately in view of the danger attached to its opening a back-door

for 'dealing on the basis of interest. Safeguards would, therefore, need to be devised so as to restrict its use only to inescapable cases. (paras.l.16-1.17)

(f) Hire-purchase.--Under this system, banks may [fiance the purchase of machinery and equipment as well as purchase of consumer durables under a joint-ownership arrangement subject to provision of security or surety. They would receive.jn addition to repayment of the principal, a share in the net rental value of these items in proportion to their outstanding share in total investment. (para. 1.18).

(g) Financing on the basis of normal rate of return. --Under this system a specialized public agency may determine the normal rate of return in each industry, business etc., and the banks may provide funds to the entrepreneurs with the assurance that a certain minimum rate of profit would be payable to the bank on the amount provided by it. If the actual rate of profit exceeds the designated normal rate of return, the difference would be paid voluntarily by the entrepreneur to the financing institution. In case, however, the rate of profit turns out to be lower, or if there is a loss, the entrepreneur concerned would have to prove the same to the satisfaction of the specialised public agency, in which event the financing institution may accept the lower rate of profit or share in the loss. However, in view of the strong possibility that a widespread use of this method may in practice degenerate into pure interest it needs to be applied on a very limited scale and only where unavoidably necessary. (para. 1.19)

(h) Time multiple counter loans.--Under this method a bank may give by way of interest-free loan a multiple of interest-free deposit by a client so that the product of the money and time for which money is given is the same in both the cases. It would, however, not be correct to use this method by way of a permanent alternative system to the interest-based system. However, in order to provide personal loans to people of small means banks may instead of the above stipulations, adopt it as a principle that they would provide loans for personal and non-productive purposes only to those persons who already hold accounts with them. In laying down the repayment schedule and the amount of the loan, however, the banks may keep in view the amount of the deposit of the applicant for the loan and the period over which he has maintained his deposit with the bank. (para. 1.20).

(i) Special loans facilities:--Under this facility interest-free loans may be provided by banks and other financial institutions in cases where neither PLS nor any of the other alternative methods is feasible, provided that the purposes/projects for which finance is given are for general welfare of the community. However, in order to minimise the impact of such loaning on the profitability of the financial institutions, it should be ensured that it remains restricted to a scale considered absolutely necessary. (para. 1.21)

The Council is of the view that to replace interest, use should be made of PLS System as well as the devices under items (c) to (i). (para. 1.22).

5. While evolving a workable mechanism for financing on profit/loss sharing basis suited to our conditions, the Council has kept in view the Fiqh literature on the subject of Shirkat and Mudarabat. The stipulations pertaining to Shirkat provide that partners are free to agree on any profit-sharing ratios, but losses are to be shared strictly in proportion to the respective capital contributions. The Council, however, felt that under the proposed profit/loss sharing system, the division of profits between the financial institutions and business and industrial concerns should be regulated by the central bank of the country. The financial institutions may also enjoy the powers of inspection of the projects and their books of accounts and to participate in the decision-making process. (para. 1.23).

6. To ensure smooth and unhindered return flow of funds, delay in the payment of amounts due to the banks should attract a penalty for non-payment. However, the amount of the fine should not accrue to the banks but deposited in the Government treasury. Since delay and defaults without genuine reasons would not only be a breach of trust but also jeopardise the success of the new system, deterrent punishments should be provided to defaulters which may include confiscation of property. Delinquents should be black-listed and debarred from any future financial assistance by banks. (para. 1.24).

7. For the success of the new system it will be imperative that banks enjoy free and unfettered discretion in respect of acceptance or rejection of financing proposals received by them on the basis of sound banking principles and criteria. Such public sector enterprises as do not meet the citeria of sound banking may either be financed by a separate public agency or the banks should be guaranteed the repayment of the capital and provided with a subsidy by the Government equivalent to the average rate of profit of the bank. A thorough**- on going** reforms of the auditing system, which presently suffers from a number of weaknesses, will also be necessary for ensuring the success of the new system. (paras. 1.25-1.26).

8. The remodelling of the operations of the commercial banks on the basis suggested in this Report would represent a radical departure from the traditional British pattern of banking on which the commercial banks in this part of the world have been largely operating. However, in the broader international context a reorientation of bank financing on the lines suggested cannot be regarded as entering a field that is completely untried. It cannot be denied that elimination of interest from banking and financial system as a whole is a bold enterprise and problems and difficulties are sure to arise in the initial period. However, once the new arrangements are put into practice and worked in right earnest, a process of evolution would be set in motion and practical solutions to the emerging problems would be found. (paras 1.27-1.30).

9. The Council considered three different options with a view to suggesting an action plan for the elimination of interest from the economy. These were:

(a) A model bank may be set up which may start operations on interest-free basis and, on the basis of experience gained from its working, the

operations of the commercial banks and other financial institutions may be reorganised on interest-free basis subsequently.

(b) A comprehensive scheme may be prepared for a complete switch-over to the interest-free economic system and then the timing of such a switch-over may be decided.

(c) Interest may be eliminated from the economic system in a phased manner.

The third option was considered to be the most practical and reasonable. It was in this perspective that the Council had earlier recommended elimination of interest from the operations of N.I.T. and I.C.P. as well as from housing finance provided by H.B.F.C. and the commercial banks in the initial phase. A beginning towards elimination of interest in a phased manner has already been made with the switch-over of the NIT, HBFC and ICP Mutual Funds to-interest-free operations with effect from July 1, 1979 and the decision announced in the last budget not to charge any interest on bank loans for production purposes to farmers cultivating holdings up to 12 acres.

The Council also considered a suggestion mooted in certain quarters that initially only interest-free counters may be opened in the existing commercial banks which may operate simultaneously with interest-based system and that depositors may be given the option to keep their money with banks on PLS basis or on interest basis. The Council strongly opposes such a course of action because it is not only inappropriate but also extremely dangerous, as it is likely to entail perpetuation of the interest-based system and to undermine the efforts at introducing interest-free banking in the country.

The Council has recommended that during the period of about 1 year and 8 months that now remains within the 3 years time limit set by the President, the rest of the measures for elimination of interest from the domestic transactions should be taken in three clearly defined phases with specific time schedule. The first phase should start on July 1, 1980 and should cover selected Government transactions with the State Bank and commercial banks, certain inter-governmental financial transactions, Federal and Provincial Governments' loans to local bodies and autonomous corporations in respect of non-profit/earning but essential projects, taccavi loans, loans to Government employees,employees provident fund balances, penalty on Government overdues, commercial bank financing of seasonal needs of the farmers, housing finance by commercial banks, personal loans, Small Business Finance Corporation's financing of means of transport and loans by ICP under its investors' scheme.

The second phase to go into effect from July 1, 1981 should aim at eliminating interest completely from the assets aside of the banks and other financial institutions in so far as they pertain to domestic transactions. In addition, the remaining elements of interest in the domestic transactions of the Government should be eliminated.

In the final phase of the elimination of interest from domestic transactions, to take effect on Ist January, 1982, banks should cease to accept deposits from the public on the basis of interest and switch-over to profit/loss sharing. Inter-bank transactions would also be switched-over to profit/loss sharing system and State Bank would abandon the system of providing finance to banks and other financial institutions' on the basis of interest and would bring about necessary changes in its monetary policy as set out in Chapter IV of the Report. (paras. 1.31-1.35)

10. Elimination of interest from transactions relating to international trade and aid, which poses the most difficult problems, should be covered in the third phase. It is necessary to accelerate the efforts for greater economic co-operation among Islamic countries so as to achieve interest-free international trade and aid at least among them. The Islamic Development Bank can also play an important role in this respect. At the same time, by setting a practical example of the Islamic economic and technical system we should seek to convince others about the blessings and virtues of the Islamic system. (para. 1.36)

Chapter II: Commercial Banking

The Chapter suggests alternative mechanisms for replacing interest in domestic banking transactions. Complete elimination of interest from international trade transactions cannot be achieved by the lone efforts of a single country. However, measures should be taken to minimise the element of interest even in international trade transactions. (para. 2.3)

2. Under the new system, banks may provide finance on PLS basis for fixed investment in industry to parties maintaining accounts audited by Chartered Accountants. Parties whose accounts .are not audited by Chartered Accountants may be accommodated under "hire-purchase", "Bai Muajjal" or "leasing" arrangements. Smaller parties who may not be in a position to maintain proper accounts may be financed under "normal rate of return", "hire-purchase" or "Bai Muajjal" arrangements. (para. 2.6).

3. Banks may also' formulate new projects themselves singly or in collaboration with non-bank financial intermediaries, and the plant and machinery required for these projects may be financed by them on the basis of "investment auctioning". (para. 2.7)

4. Under the new system the financing agreements would provide for monitoring by the banks of the actual performance of the projects financed by them so as to safeguard their interests. (para. 2.8)

5. Finance provided for fixed industrial investment under bridge financing arrangements based on "stand-by" technique of underwriting, currently in vogue, is not compatible with Sharia and needs to be substituted by "firm commitment" underwriting technique. Since the firm commitment underwriting is not permissible under the Companies Act, necessary changes in the Act may be made to permit the use of this technique. (para. 2.9)

6. Debenture financing may be replaced by the issuance of a new corporate security to be called the Participation Term Certificate (PTC). (para. 2.10)

7. Working Capital requirements of industry are at present being met through the grant of cash credit, overdrafts, demand loans and bill discounting arrangements. These facilities, with the exception of bills discounting, may be provided on PLS basis in the case of firms maintaining proper accounts and having regular dealings with the financing bank. In other cases, finance may be provided under "normal rate of return" arrangements or "Bai Muajjal". In the case of bill discounting, the Council has recommended a procedure designed to bring this type of financing in conformity with the Sharia, (para. 2.11)

8. In providing short-term finance to farmers, the commercial banks should distinguish between farmers cultivating holdings up to the subsistence level and those cultivating holdings above the subsistence level. Farmers with subsistence holdings may be provided assistance in cash or kind without any charges under the "Special Loans Facility". Ordinarily such loans should be provided out of funds raised by banks on interest-free basis. However, if such funds are inadequate banks may be provided a subsidy by the Government in respect of such loans on the basis of the average rate of profit of commercial banks during the relevant period. (para. 2.16)

9. Short-term finance to farmers withholdings above the subsistence level may be provided by banks under "Bai Muajjal" or "Bai' Salam" arrangements.(para. 2.17).

10. Medium and long-term finance is required for purchase and maintenance of agricultural machinery and implements, sinking of wells, installation of tubewells, land development, construction of storage, poultry and dairy farming etc. Replacement of interest in medium and long-term financing in the agricultural sector by a single substitute conforming to Sharia is not possible. Therefore, the various alternative methods will have to be used for different purposes. (paras. 2.18-2.22)

11. Under the new system, small retailers, who are not in a position to maintain accounts, may be provided finance either under "Bai-Muajjal" arrangements or under "Special Loans Facility" out of resources raised by them on interest-free basis. In case these are inadequate, the Government may provide a subsidy to the banks on the amount of such loans on the basis of average rate of profit of the commercial banks in the relevant period. In regard to bank financing of the commerce sector under cash credit, overdraft, demand loans, and discounting of bills, the above arrangements as those recommended in respect of financing of working capital requirements of industry may be applied. In the case of opening of letters of credit, the banks may charge a commission for the service rendered by them and they may not necessarily share in the profit/loss. (para. 2.23)

12. For financing house construction by individuals, commercial banks may adopt the same system as was recommended by the Council in its earlier report and has been put into practice by the House Building Finance Corporation. Financing of construction

companies both for fixed investment and working capital may be strictly on PLS basis. (para. 2.24)

13. Banks may finance purchase of trucks, buses, taxis, vans, rickshaws and private cars under "hire-purchase" or "Bai Muajjal" arrangements. (para. 2.25)

14. With the exception of services sector, in which case banks may use any of the alternative methods of financing considered permissible under the Sharia, PLS seems to be the only practical basis for financing of other sectors. In case of finance required for purchase of capital goods and machinery, techniques of "Bai Muajjal" or "Investment Auctioning" may also be used. (para. 2.26)

15. Banks may generally not provide any personal loans. Loans to finance educational expenses of meritorious students may, however, be provided without interest. Purchase of consumer durables under economically justifiable conditions may be financed under "Bai Muajjal" or "hire-purchase" arrangements on a restricted scale. Personal loans in calamity-stricken areas may be provided by the Government from the Federal Zakat Fund. (paras. 2.27-2.28)

16. In order to avoid any adverse effect on depositor's confidence and deposit mobilisation by banks, 'deposits in the short transitional period may continue to be accepted by banks on the existing basis. (para. 2.29)

17. Under the new system, variable return would be payable on savings and time deposits on the basis profit/loss of banks. (para. 2.30)

18. The nomenclature of deposits as well as the rules and procedures governing the operation of deposit accounts should remain unchanged for the time being in order to avoid the possibility of confusion. However, some changes in the banking terminology could be helpful in creating a sense of the radical change in the system. The banks should also continue to enjoy full discretion in regard to the deployment of the deposit resources. The Government may also continue the guarantee provided to deposits of nationalised commercial banks for a short transitional period after the switch-over of deposits to the new system. (para. 2.33)

19. In order to avoid frequent shifts of deposits from banks with lower profitability to banks with higher profitability, the rates of return on deposits held with nationalised commercial banks should be made uniform by pooling their profits for distribution among depositors. (para. 2.34)

20. Inter-bank transactions may be carried out under PLS arrangements. (para. 2.35)

21. The State Bank's Financial assistance to commercial banks under its various refinance schemes as well as those for meeting temporary liquidity shortages may normally be provided under PLS arrangements. (para. 2.36)

22. The operations of foreign branches of Pakistani banks, foreign currency deposits held with commercial banks in Pakistan and certain other transactions of banks with banks abroad would have to continue on the basis of interest. In order to avoid merger of interest and non-interest income, however, the administration of foreign branches of Pakistani commercial banks may be entrusted to a separate corporation to which foreign currency deposits held with commercial banks should also be transferred. This corporation should not accept local deposits. (para. 2.37)

23. Commercial banks loans to their employees may be on the lines suggested in the case of the employees of the State Bank. (para. 2.38)

Chapter III: Speelallsed Financlal Institutions

The Council has made its recommendations in respect of elimination of interest from the operations of NIT, ICP and HBFC in an earlier Report. Its recommendations relating to other specialised financial institutions are contained in this Chapter. (para. 3.1)

2. The assets of Pakistan Industrial Credit and Investment Corporation (PICIC) involving interest conisit of debentures purchased foreign and local currency loans and deposits held with banks. PICIC's liabilities inolving interests are: debentures issued, line of credit in foreign currency and rupee borrowings. (para. 3.4)

3. Since a portion of PICIC’s share capital is also held by foreign investors it appears necessary that the assent of foreign shareholders be obtained for the elimination of interest from its operations. In case they are not agreeable, they may be given the option to disinvest their shares. (para. 3.5)

4. After the cut-off date for elimination of interest, PICIC may not purchase any new debentures but may instead purchase the proposed Participation Term Certificates CPTCs). (para. 3.6)

5. PICIC provides loans in local and foreign currencies for acquisition of fixed assets at rates of interest fixed by the Government. After the cut-off date it may switch over completely to interest-free forms of financing discussed in Chapter I. (para. 3.7)

6. The deposits of PICIC with banks may be held on PLS basis after the elimination of interest from the deposits side of commercial banks. (para. 3.8)

7. The present underwriting arrangements which give rise to bridge finance on interest basis may be replaced by the system of "firm commitment" underwriting which is compatible with Sharia. (para. 3.9),

8. For raising local currency resources, PICIC may, instead of issuing debentures, issue Participation T erm Certificates. The debentures already issued may also be replaced by PTCs, to the extent possible, with the consent of the holders and the rest may be allowed to run their course. (para. 3.10)

9. The long-term rupee loans, secured by PICIC from the Government to broaden its equity base, may be converted into Government investment on PLS basis or replaced by PTCs to be issued by PICIC to the Government. Future Government assistance to PICIC may either be on PLS basis or through purchase of its PTCs. (para. 3.14)

10. The Government of Pakistan may forego the portion of interest payable to it by PICIC on the long-term rupee loan granted by the U.S. Aid and may instead share in PICIC's profit/loss related to the amount of the loan. In respect of the portion of interest payable to U.S. Aid, an effort may be made that the U.S. Aid foregoes its interest claim. If they do not agree, then the existing arrangements may continue. (para. 3.12).

11. PICIC's foreign currency borrowings may continue to be on interest-basis until a viable alternative conforming to Sharia is available. (para. 3.13)

12. PICIC’s borrowing from the State Bank may be on PES basis, with a suitably lower profit-sharing ratio inrespect of finance provided under the Refinance Scheme for locally-fabricated machinery. (para. 3.14)

13. The functions and operations of Industrial Development Bank of Pakistan, (JDBP) are similar to those of PICIC. The changes required for elimination of interest from its operations would, therefore, be similar to those suggested in the case of PICIC. However, it differs from PICIC in so far as it also provides finance from working capital and accepts deposits from the public. In these respects the recommendations in regard to commercial banks would also generally apply to IDBP. (para. 3.17)

14. The operations of National Development Finance Corporation (NDPC) are similar to those of PICIC and IDBP. The changes required for elimination of interest from its operations would, therefore, be broadly the same as those suggested in the case of PICIC and IDBP. (paras. 3.18--3.20)

15. In the case of the Agricultural Development Bank of Pakistan (ADBP), deposits accepted by it should be subject to similar arrangements as those suggested for commercial banks. Loans received from the State Bank may either be on PLS basis or free of cost. Borrowings from international agencies may continue to be interest-bearing until alternative arrangements compatible with Shar'ia become available. Financing by ADBP with the assistance of both foreign loans and locally-raised resources would need to be on the same basis as outlined in respect of agricultural financing operations of commercial banks. (para, 3.24)

16. The Small Business Finance Corporation (SBFC) at present provides financial assistance to persons of small means on interest basis. After the cut-off date it may provide finance for purchase of trucks, wagons, taxis etc., on the basis of "hire-purchase" or "Bai Muajjal' while cycle advances may be provided free of cost. Financing of small industries, small business and of professions may be on the basis of normal rate of return. The Corporation's deposits maintained with banks would be treated like other private

sector deposits. Borrowings from the Government may either be free of cost or on PLS basis, while those from commercial banks may be on PLS basis. (paras. 3.25--3.29)

17. In the case of the Equity Participation Fund (EPF), interest is involved only in bridge finance which may be done away with by adopting the system of "firm commitment" underwriting as suggested in the case of commercial banks. On the liabilities side, interest may be eliminated on lines similar to those suggested in respect of IDBP. (para. 3.31)

18. The Federal Bank for Co-operatives (FBe) is the apex institution in the co-operative credit structure. The other two tiers of the cooperative credit system are Provincial Cooperative Banks and the primary cooperative credit societies. The Council recommends that the financing operations of the cooperatives may be reorganised on the same lines as proposed in regard to the agricultural financing operations of commercial hanks. The State Bank's financial assistance to the cooperative credit institutions may be free of any charge in respect of their interest-free loans. However, in respect of their financing carrying return, the State Bank's financial assistance may be provided on PLS basis. (paras. 3.32--3.36)

19. Deposits of the cooperatives banks and cooperative credit societies may be governed by the same stipulations as suggested in the case of deposits held by commercial banks. (para. 337)

20. To ensure the success of the new system, it would be necessary to bring about an improvement in the quality of management of the societies, tighten their supervision by the Provincial Cooperative Banks and expand the system of supervised financing. (para. 3.38)

21. The system of insurance, in its present form, involves not only the element of interest but also that of gambling. It needs to be organised on cooperative basis, along the lines indicated in the text, and its benefits should be confined to those people who are prepared to offer financial sacrifice for the sake of common good. (para. 3.43--3.46)

Chapter IV: Central Banking and Monetary Policy

The responsibilities and functions of the State Bank under the interest-free system will remain generally the same as at present and most of the monetary policy instruments available to the State Bank would also remain largely unaffected. However, the bank rate weapon would become redundant after interest is completely eliminated from the system. State Bank's financial assistance to banks and other financial institutions, which is also a device for regulating money and credit, would also undergo a change in so far as it would need to be provided on PLS basis instead of fixed interest rates. Abolition of interest would also have some implications for open market operations. (paras. 4.1--4.2)

2. The State Bank would continue to use its power to require the scheduled banks to maintain minimum cash reserves with it against their demand and time liabilities and will continue to use this instrument under the interest-free system. Since the State Bank does not pay any interest on these reserves, no change in this regard will be needed. However, the State Bank charges penal rates of inerest in cases of non-observance of this requirement by banks. This power may be replaced by the power' to impose fines per day related to the amount of the default. (para. 4.4)

3. It will be possible to retain liquidity ratio requirements as an instrument of monetary policy with the only change that the interest-bearing securities held in the portfolio of banks will have to be replaced by such financial instruments as are permissible under Sharia. The State Bank's power to impose penal interest in case of non-observance of the statutory requirement would also need to be replaced by the power to impose fines. (paras. 4.5--4.7)

4. No change will be needed in regard to the instrument of prescribing overall credit ceilings for commercial banks with a view to regulating credit expansion in the private sector. However, the power of charging penal interest rates will have to be replaced by the power to impose fines. (paras. 4.8-,4.9)

5. Mandatory targets are prescribed by the State Bank for commercial banks to ensure the provision of at least the designated amounts of finance to specified sectors to help achieve the socio-economic objectives. No change will be required in this except that the power to charge penal interest rates will have to be replaced by the power to impose fines. (para. 4.10)

6. Selective credit controls which are used as a device for curbing an excessive use of credit for specific purposes or for encouraging the flow of credit towards desirable uses, do not involve any element of interest and would, therefore, continue to be made use of as at present. (para. 4.11)

7. The State Bank's power to issue directives to banks would continue to be exercised; (para. 4.12-4.13)

8. Moral **suasion,** which signifies informal consultations between commercial banks and the central bank on various issues and for inducing the banks to follow the policy guidelines of the central bank, would not be affected in any way by the abolition of interest. (para. 4.14)

9. The bank rate weapon would need to be replaced "by the power on the part of the State Bank to fix its profit-sharing ratio or ratios in respect of its own financial assistance to banks and other financial institutions as also the power to prescribe maximum and minimum profit-sharing ratios for scheduled banks in respect of finance provided by them. (paras. 4.16-4.17)

10. The State Bank's power to prescribe minimum interest rates payable on savings and time deposits may he replaced by the power to prescribe weights to be given to these deposits for the purpose of profit distribution by the banks. (para. 4.20)

11. The State Bank's role as "lender of the last resort" as well as the provision of refinance by it to commercial banks and other financial institutions would not be affected by the abolition of interest. However, under the new system such assistance would in general be provided under PLS arrangements or other alternative methods permissible under the Sharia. (paras. 4.21-4.22)

12. Abolition of interest will not necessitate any change in respect of deposits of the Federal and Provincial Governments held with the State Bank since even at present no interest is paid on these deposits. (para. 4.29)

13. The State Bank's short-term loans and advances to Federal and Provincial Governments, currently provided on interest basis, may be- provided free of interest. (para. 4.30)

14. As it would not be feasible under the new system for the Government to issue fresh market loans on terms compatible with Sharia, the medium and long-term borrowing requirements of the Government would also need to be met by the State Bank free of any charge. (para. 4.31)

15. The note issued by the State Bank is backed largely by Government securities and holdings of foreign exchange both of which contain elements of interest. While the Government securities would be made interest-free under the new system, foreign exchange holdings abroad may have to be continued on interest basis till a viable alternative becomes available. (para. 4.33)

16. State Bank's transactions with international financial institutions and foreign aid agencies would have to be continued on the basis of interest until a viable solution is evolved in consultation with the parties concerned. (para. 4.34)

17. State Bank's 'advances to its employees, which are at present interest-bearing may be made interest-free subject to suitable quantitative limitations. Employees' provident fund balances on which interest is paid at present may be invested in NIT Units and profits earned on them credited to the employees' provident fund accounts. Interest involved in miscellaneous domestic transactions may be replaced by a service charge, wherever feasible. (para. 4.35)

18. The major goals of economic policy in an Islamic society are broad-based economic development and social justice. To help achieve these objectives, the central bank should strive to so manage the banking system as to generate money and credit flows in line with the requirements of a realistic rate of growth without jeopardising monetary and economic stability. At the same time, it should not only ensure that all sections of the society which can make productive and efficient use of bank finance have

access to the banking system but should also bring about a more equitable distribution of bank finance. (para. 4.36)

19. Monetary policy alone cannot achieve the socio-economic objectives of an Islamic society unless other Government policies also work in the same direction. The Government of an Islamic State should so fashion its fiscal policy as to lend sufficient strength to monetary policy. (paras. 4.37-4.38)

Chapter V: Government Transactions

After the abolition of interest, fresh market loans carrying a fixed rate of interest would no longer be issued. It would be difficult to raise resources on PLS basis. The borrowing requirements of the Government will, therefore, have to be met by the State Bank on interest-free basis. (paras. 5.1--5.3)

2. Ad-hoc treasury bills, currently issued by the Federal Government to State Bank at a nominal rate of interest to meet specific financial needs, may be issued on interest-free basis after interest is abolished. However, treasury bills on tap and Government treasury deposit receipts would no longer be issued. The Government could instead have recourse to short-term borrowing from the State Bank. (paras. 5.5-5.6)

3. The ways and means advances of the State Bank to the Federal and Provincial Governments would be provided by the State Bank free of interest after interest is abolished. (para. 5.7)

4. No interest will be charged by the State Bank on Government debtor balances. (para. 5.8)

5. Government borrowings from commercial banks for financing commodity operations would be free of interest while counter-finance may be provided by the State Bank to commercial banks in the form of interest-free ·loan5. (para. 5.9)

6. There would be no scope for small savings schemes operating at present on the basis of interest. The existing small savings certificates would, however, be allowed to run their course while deposits in the post office savings banks accounts may continue and their proceeds invested in profit-earning avenues and the profits arising therefrom may be distributed among depositors. The Prize Bonds Scheme may be tapered off gradually. (para. 5.11)

7. The Federal Government may provide financial assistance to Provincial Governments for meeting their development and non-development expenditure without any charge. The interest-bearing foreign loans channelled by the Federal Government to the Provincial Governments may, however, continue on the basis of interest till a viable alternative compatible with Sharia is found in respect of borrowings from abroad. (paras. 5.12-5.13)

8. Government borrowings from external sources will have to be continued, for the time being, on the basis of interest. However, efforts should be made to reduce dependence on foreign aid and for greater economic co-operation among Muslim countries. (para. 5.14)

9. Loans from the Federaiand Provincial Governments to local bodies, autonomous corporations etc. may be provided free of interest for financing non-profit-earning essential projects. For profit-earning projects finance could also be obtained from banks and other financial institutions on a basis conforming to Sharia. Interest-bearing foreign loans channelled by the Government to these bodies would, however, need to be continued on the existing basis" (para. 5.15)

10. Provident fund balances of the employees may be invested in N.I.T. Units or other suitable investment media and the profits arising therefrom may be credited to the employees' provident fund accounts. (para. 5.16).

11. Taccavi loans may be provided by the Provincial Governments free of interest. (para. 5.17)

12. Loans by the Federal and Provincial Governments to their employees for construction of houses, purchase of cars, motor-cycles etc. may be provided free of charge and considered as part of the fringe benefits to the Government employees. (para. 5.18)

13. The practice of charging penal interest on Government overdues may be replaced by imposition of appropriate fines. (para. 5.19)

654/FSC